جدید تکنیک کے افقِ ادب پر نمودار ہونے والا اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ

پیاسی موجیں

شام بارکپوری

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

بار اول　　ایک ہزار　　ستمبر ۱۹۷۹ء

طبع: ابھقو آرٹ پریس، ڈھاکہ

کتابت: قاسم انیس، ڈھاکہ

~~مقام اشاعت اور ملنے کا پتہ~~

~~۷/۱۱ اقبال روڈ، محمد پور، ڈھاکہ~~

اور

پکچر پیلس ــ کھلنا　　قیمت: دس ٹاکا

ہندوستان میں ملنے کا پتہ

عبد الحمید، ۱۵۱ رابندرا سرانی۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

قیمت: ۷ روپے

پاکستان میں ملنے کا پتہ

محمد بک ہاؤس ۲ کچہری روڈ انارکلی۔ لاہور

اور

بار کیور نلی

۳ ایچ ۱۱/۱۴ ناظم آباد نمبر ۳ کراچی ــ ۱۸　　قیمت: ۷ روپے

انتساب

تعفن

★ اُن خود غرض اور مطلبی دوستوں کے نام۔
جن کے چہرے پر دوستی اور ہمدردی کا نقاب چڑھا ہوا ہے۔

★ انسانیت کے علمبرداروں کے نام۔
جن کے چہرے انسانیت کے خون سے لہولہان ہیں۔

★ عدل وانصاف کی ترازو کے نام۔
جس میں ناانصافی اور ظلم وستم کا پلڑا بھاری ہے۔

خوشبو

اُن افراد کے نام۔
جنہوں نے اجنبی ہونے کے باوجود اپنوں سے بڑھکر ہمدردی اور دلجوئی کا ثبوت دیا۔

گذری ہوئی اُن حسین یادوں کے نام۔
جو اب کبھی بھی لوٹ کر نہیں آسکتیں۔

اُس ذہن اور احساس کے نام۔
جس پر پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا۔

وقت کے نام۔
جو کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

پھولوں کی خوشبو کے نام۔
جو قید نہیں کی جاسکتی۔

دل، آنسو، تارا اور وعدہ کے نام۔
جس کے ٹوٹنے کی صدا کوئی نہیں سنتا۔

اور

جمالؔ مشرقی اور حسینی نوریؔ کے نام
جن کے تعاون سے یہ مجموعہ منظر عام پر آسکا۔

افسانے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک

فہرست

کہہ رہا ہے موجِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

پہلا لفظ

ڈاکٹر سیّد یوسف حسن
(پی۔ ایچ۔ ڈی)

بنگلہ دیش کی تشکیل کے ساتھ ہی اردو بولنے اور لکھنے والے کچھ عجیب دور سے گذرے۔ ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوئے جس کے لئے وہ ذہنی طور پر قطعی تیار نہ تھے۔ یہ انقلاب ان کے لئے ایک ایسا بھونچال تھا جس نے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا ۔۔۔ بھگدڑ مچ گئی۔ ہر طرف تاریکی تھی اور اس تاریکی میں آہ و بکا، چیخ و پکار کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا، مگر یہ کٹھن وقت بھی آہستہ آہستہ کٹتا چلا گیا۔ بنگلہ دیش میں اردو بولنے اور لکھنے والوں کیلئے پانچ سال کا دور، ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اس دور میں انہوں نے جو ادب (نظم و نثر) تخلیق کیا، اس کا موضوع وہی "انقلاب" تھا۔ جس نے ان کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اسی دور کی تخلیق نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "نجم و شرر" ہے۔ بنگلہ دیش کے چند اردو شعراء کے کلام کا غالباً یہ پہلا مجموعہ ہے جو بنگلہ دیش کے قیام کے بعد اس سرزمین سے شائع ہوا۔ اب آپ کے سامنے بنگلہ دیش کے ایک ممتاز اردو افسانہ نگار شام بارکپوری کے افسانوں کا مجموعہ "پدما کی موجیں" ہے۔ یہ اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ

ہے ۔جو بنگلہ دیش کے بننے کے بعد یہاں سے شائع ہوا۔

بنگلادیش کے قیام سے قبل یہاں اردو افسانہ نگار خاصی تعداد میں موجود تھے ۔اب گنتی کے چند افسانہ نگار رہ گئے ہیں۔جن میں زین العابدین، غلام حیدر نے تو لکھنا ہی بند کر دیا ہے ۔احمد سعدی تو یوں بھی کم لکھتے ہیں ۔ ایوب جوہر پابندی سے لکھ رہے ہیں۔ شام بارکپوری کے قلم کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی ہے ۔

شام بارکپوری کے افسانے میں ایک زمانے سے پڑھتا آرہا ہوں ۔ خاصے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ تقریباً پندرہ برس سے افسانہ لکھ رہے ہیں اور چھپ رہے ہیں۔ مگر انہوں نے کبھی شہرت اور نام و نمود کی خاطر نہیں لکھے اور نہ کبھی انہوں نے نظریاتی طور پر بٹے ہوئے کسی گروہ سے خود کو منسلک کیا۔ افسانے" ہابی "کے طور پر لکھتے ہیں، جو محسوس کرتے ہیں، کہانی کے روپ میں پیش کر دیتے ہیں۔ ابتدا میں رومانی افسانے لکھتے تھے۔ آپ کا پہلا افسانہ "آنسو" ۱۹۵۷ء میں تصنیف ہوا تھا، جب آپ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ یہ افسانہ پڑھکر کبھی آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ پانچویں جماعت کا طالب علم ایسا افسانہ لکھ سکتا ہے۔ افسانہ "آنسو" فنکار کراچی، ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اسکے بعد آپ نے متعدد افسانے لکھے جو مندرجہ ذیل رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اخبار جہاں کراچی، ساقی کراچی، نقاد کراچی، انشا کراچی، لیل و نہار لاہور، نصرت لاہور، گلفشاں لاہور، قندیل لاہور، ادب لطیف لاہور، اردو ڈائجسٹ لاہور،

سیارہ ڈائجسٹ لاہور، تحریک نئی دہلی اور رگِ سنگ کانپور، وغیرہ۔

شام بارکپوری کو اپنے افسانے کیلئے موضوع کی تلاش کرنی نہیں پڑتی۔ ارد گرد پھیلے ہوئے ہزاروں موضوعات میں کسی ایک موضوع کو لیکر کہانی کا روپ دے دیتے ہیں۔ پڑھنے والے بغیر کسی تاثر کے محض ایک معمولی سی کہانی سمجھ کر پڑھتا جاتا ہے۔ مگر پڑھنے کے دوران اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے، یہانتک کہ ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں پہنچنے کے لئے اس کا ذہن تیار نہیں ہوتا ــــ پڑھنے والا اچنبھے میں پڑ جاتا ہے۔ اسی مقام پر کہانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال کر اچانک کہانی کو ختم کر لینا شام بارکپوری کے افسانہ نگاری کی ایک خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیت ان کا "سمبل" ہے کہانی کا پس منظر، اس کے کردار اور کرداروں کے ساتھ رونما ہونے والے واقعات جو ہمارے روزمرہ سیاسی اور سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے بعض افسانوں میں "سمبل" بھی پیش کرتا ہے۔ شام بارکپوری بھی ہمارے سینکڑوں افسانہ نگاروں کی طرح آرام دہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر غریب اور نچلے طبقے کے افراد کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ غریبوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ ظلم سے نفرت کرتے ہیں ــــ مگر غربت دور کیسے ہو؟ ظلم کا خاتمہ کیسے ہو؟ شام بارکپوری کے افسانوں میں ان کا کہیں حل نہیں ملتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار جاندار ہونے کے باوجود مایوسی اور لاچاری کے شکار ہو جاتے ہیں۔

افسانہ نگاری میں حسن بیان کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ قصہ کی دلچسپی حسن بیان کے بل بوتے پر قائم رہتی ہے۔ اس لحاظ سے شام بارکپوری کے افسانے کامیاب ہیں۔ بیان میں تسلسل اور روانی ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔ واقعات اور کرداروں کے درمیان ربط قائم رہتا ہے۔ مکالمے موزوں اور مربوط ہیں۔

افسانہ نگاری میں ایک اہم فضا ہے۔ شام بارکپوری نہایت خوبصورتی سے اپنے افسانوں کے لئے فضا تیار کر لیتے ہیں۔ جہاں تک ماحول کا تعلق ہے۔ انکے افسانوں میں اس کی پوری عکاسی ملتی ہے۔ ان کے کردار ماحول کے صحیح پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ ماحول اور کردار میں ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے افسانوں میں مقامی رنگ کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً جنگل، دریا، ندی، نالے، سیلاب، طوفان، ناریل اور کیلے کے درخت، جھونپڑیاں، مچان، مچھلی، بنسی، دھان اور پٹ سن کے کھیت اور ان کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور مزدور۔ ان کے رہن سہن کے طریقے اور کھانے پینے کے انداز۔

شام بارکپوری کے افسانوں میں مجھے سب سے زیادہ " سانپ اور انسان " پسند آیا۔ جس میں افسانہ نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان ـــ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود درندگی اور بربریت میں سانپ سے ایک قدم آگے ہی ہے۔ " روح " " دھرتی کو آکاش پکارے " اور " پدما کے کنارے " شام بارکپوری کے اچھے افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ افسانہ " روح " کا کینوس بہت بڑا ہے۔ ایک بھوک سے تڑپتے ہوئے

لڑکے کی روح بھٹکتی ہوئی ہر اس مقام پر پہنچتی ہے جہاں انسان ظلم وستم کا شکار ہے۔" پدما کے کنارے" بنگال کے ایک غریب کسان کی ایک نہایت المناک کہانی ہے۔ جسے افسانہ نگار نے بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

میں شام بارکپوری کو ان کے افسانوں کا مجموعہ" پدما کی موجیں" کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ یہ اردو دنیا میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور پسند کیا جائے گا۔

۱۷ر جولائی ۱۹۷۹ء

پدما کے کنارے

پدما ایک وجیہہ اور متین عورت کی طرح مٹیالی رنگ کی ساڑی پہنے آنچل کو ہوا میں اڑاتی ہوئی رقصاں تھی۔ اس کی موجیں اتنی آہستہ خرامی سے بہہ رہی تھیں کہ جیسے جل پریاں دھیرے دھیرے رقص کر رہی ہوں اور جنہیں دیکھکر کوثر و تسنیم کی موجوں کو بھی شرم آنے لگے۔ گہرے نیلے آسمان کے نیچے موسیقی کی ہلکی ہلکی تانیں بکھیرتا ہوا پانی سبک خرام ہواؤں سے مہکتی اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی فضا —— سفید سفید بگلے سطح آب پر پانی کی چھینٹیں اڑاتے پھر رہے تھے۔ پدما کے چوڑے پاٹ پر انگنت کشتیاں رواں دواں تھیں۔ ایک چھوٹے سے گھاٹ کے نزدیک سلطانہ کی جھونپڑی تھی۔ اسے اچھی طرح جھونپڑی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ دھان نکال کر جو پیال بچ جاتا ہے۔ اس سے چھپر ڈال کر ایک جھونپڑی سی بنالی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ ہی ایک گئوشالہ بھی تھا۔ جھونپڑی میں سلطانہ اور اسکے شوہر رہتے تھے۔ اور گئوشالہ میں دو گائیں اور ایک بکری —— بانس اور مٹی سے جھونپڑی کی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ گھر کے احاطہ کے چاروں طرف بانس کی قمچیوں اور پٹ سن کی لکڑیوں سے چہار دیواری

کا کام لیا گیا تھا۔ آنگن میں کدو اور سیم کی گھنی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔

پدما کے کنارے یہ چھوٹا سا گھاٹ برائے نام تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف دو بار اسٹیمر آکر رکتا تھا۔ یا پھر کبھی کبھار ناخجی اپنی بڑی بڑی کشتیوں میں مسافروں کو لا کر دریا پار کرا جاتے تھے۔ صبح سویرے ایک اسٹیمر آکر رکتا۔ اس وقت وہ اپنے آنگن سے ٹکر ٹکر گھاٹ کا سارا منظر دیکھا کرتی تھی۔ اسٹیمر کنارے پر لگتے ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا۔ چیخ پکار سے کسی مچھلی بازار کا سماں پیدا ہو جاتا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے پہلے اترنے چڑھنے کیلئے تگ و دو شروع کر دیتا۔ وہ عورتیں جو قیمتی ساڑیاں پہن کر چڑھتی اترتی تھیں۔ ان کے شوخ اور بھڑکیلے رنگ سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ زیورات سے لدی پھدی عورتوں کے خوشنما بلاؤز دیکھکر سلطانہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔ ان کے گلے میں سونے کا تار، کانوں میں بندے، ہاتھوں میں سنہرے چوڑیاں ___ کتنے سج دھج کے ساتھ وہ پروقار انداز سے اسٹیمر سے اترتی تھیں۔ کسی کے سر پر ساری کا آنچل نہ ہوتا۔ اسکی بھی تمنا تھی کہ وہ بھی جدید فیشن کی ساڑیاں پہنے۔ مگر اس کی یہ حقیر خواہش سینے میں گھٹ کر رہ جاتی۔ پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا پھر نئے ڈیزائن کا بلاؤز اور ساڑی کہاں سے پہنتی۔

ایک بار قحط پڑا تھا۔ اس وقت اس کے پاس تن ڈھانکنے

کا کپڑا ابھی نہیں تھا۔ ایک ساڑی تھی۔ اس پر سینکڑوں پیوند لگے ہوئے تھے۔ جب پیوند کے لئے کپڑے کا ٹکڑا دستیاب نہ ہوسکا۔ تو اس نے ٹاٹ کے ٹکڑے کا پیوند لگا کر ستر پوشی کی۔ مسلسل تہہ در تہہ پیوند لگنے سے ساڑی گدڑی جیسی موٹی ہو گئی تھی۔ گرچہ وہ زمانہ گذر گیا مگر ڈھنگ کی ساڑی اب بھی اسے نصیب نہ ہوئی۔

اس نے اپنی ساڑی پر نظر ڈالی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ہاٹ سے خریدی ہوئی "لنگی ساڑی" (چار خلانے کی) ایک ماہ پھٹ چکی تھی۔ اسکے علاوہ کنٹرول سے خریدی ہوئی دوسری ساڑی بھی تار تار ہوکر اپنی رہائی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

اس دن اسٹیمر سے جو آخری بنی سنوری ہوئی جو لڑکی برآمد ہوئی تھی شاید کوئی نئی نویلی دلہن تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مسکراتی شرماتی باتیں کرتی ہوئی گاؤں کی طرف جارہی تھی۔ اس کی ساڑی قابل دید تھی۔ اس کا خوشنما رنگ نہایت دلکش تھا۔ گرچہ سلطانہ نے ساڑی چھو کر اس کی ملائمیت اور قیمت کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ مگر اس کا جاذب نظر اور دلفریب رنگ ہی اسے پاگل بنانے کیلئے کافی تھا۔ اس کے سرخ و سفید جسم پر سرخ ساڑی بہت ہی بھلی لگ رہی تھی۔

سلطانہ اپنی چہار دیواری کے اندر کھڑی سرخ ساڑی والی کو حسرت و یاس سے دیکھتی رہتی۔ اس کا شوہر اشرف الدین علی الصباح بھات

کھا کر اپنی کشتی لے کر "چر" پر چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی شام کو ہوتی تھی۔
اس کی اپنی کوئی زمین نہیں تھی سوائے اس چھوٹے سے قطعہ اراضی کے۔
جس میں سر چھپانے کے لئے انہوں نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ اشرف نے
چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا "چر" پٹواری سے حاصل کیا تھا۔ پیٹ کی
آگ بجھانے کے لئے اپنے دست و بازو سے زمین کا سینہ چیر کر دھان اگا رہا
تھا۔ ان کے گذر بسر کا واحد ذریعہ دھان تھا۔ جب بھی فصل اچھی ہوتی تو
دو حصہ پٹواری ہتھیا لیتا۔ اس زمین پر سال میں صرف ایک بار کاشت کاری
ہوتی تھی۔

پھاگن کا مہینہ رخصت ہو رہا تھا۔ اس بار دو تین ماہ سے بارش
ہی نہیں ہوئی تھی۔ صبح ہی سے دھوپ کی تپش اتنی بڑھ جاتی کہ جسم تپنے لگتا
تمازت سے آنکھیں جلنے لگتیں۔ اس کے باوجود بھی کھیتی باڑی بند نہیں ہوئی
تھی۔ کیونکہ بیساکھ میں زمین ہموار نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لئے تیز دھوپ
میں بھی اسحق کے شوہر کو کھیت پر رہنا پڑتا تھا۔ گذشتہ سال سارا دھان
سیلاب کی نذر ہوگیا تھا۔ یہ پہاڑ جیسا سال کیسے گذرے گا؟ اب تو چند ماہ کے
بعد بازار سے غلہ خریدنے کی نوبت آگئی تھی۔

سرخ ساڑی نے اسکے اندر چھپی ہوئی عورت کو بیدار کر دیا تھا۔
اس نے سوچا اتنی قیمتی ساڑی نہ سہی مگر اس سے ملتی جلتی ساڑی تو خریدی
جاسکتی ہے۔ ان دنوں کپڑوں کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ پندرہ

بلیس روپے میں مل ہی جائے گی۔ شادی کے بعد اسے ایک بھی پسند کی ساڑھی نہیں ملی تھی۔ آخر اپنے دل میں چھپے ہوئے ارمان کا گلا کب تک گھونٹے۔ کیا اس کی اتنی معمولی سی خواہش کی تکمیل نہیں ہو سکتی؟ رنگ برنگی ساڑی میں اس کا ملیح جسم کتنا نکھر آئے گا؟ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ شام کو جب اشرف الدین گھر واپس آئے گا تو ایسی ہی ساڑی کی فرمائش کرے گی۔

اچانک اسٹیمر کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ جیسے کہ کسی نے اسے خوابوں کی دنیا سے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ اسٹیمر گھاٹ سے مسافروں کو لیکر آئندہ منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ پانی میں تلاطم برپا تھا۔ لہروں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں کھلونوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔ سورج سر پر آ گیا تھا اور سلطانہ نے ابتک چولہا بھی نہیں جلایا تھا۔ اور نہ ہی بھات پکایا تھا۔ وہ فوراً بھاگتی ہوئی پڑوسن کے گھر میں آگ لینے گئی۔

۲

دو تین ماہ مسلسل بارش نہ ہونے کی وجہ سے دھوپ کی تمازت سے گھاس پھوس تک جل گئے تھے۔ دھرتی تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ زمین کے سینے سے گرم گرم بھاپ اس طرح خارج ہو رہی تھی کہ جیسے کوئی بیوہ حسرت بھری سانس لیتی ہے۔ اشرف الدین سورج نکلنے سے پہلے کشتی کھیتا ہوا اپنے کھیت پر پہنچا۔ اس وقت چڑ ...ں نغمہ سرا ہوتیں۔ نسیم صبح خرام ناز سے اٹکھیلیاں کرتی گذرتی۔ اشرف الدین کو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی مور کے پر سے اس کا

دریاؤں اور ندیوں میں یہاں وہاں چھوٹے چھوٹے جزیرے نکل آتے ہیں جنہیں بنگالی میں "چر" کہتے ہیں

جسم سہلا رہا ہو۔ اسکے جسم میں فرحت و انبساط کی لہر سی دوڑ جاتی۔ وہ سوچتا کہ کاش اسکے بھی پنکھ ہوتے اور وہ ہوا کے دوش پر آکاش پر اڑتا پھرتا۔

جب سورج کا لال سا گولا افق مشرق سے طلوع ہوتا تو خوشگوار فضا جہنم کی بھٹی میں تبدیل ہونے لگتی۔ پھر جیسے جیسے تپش بڑھتی جاتی۔ فضا میں چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہوتی۔ کھیت میں ہل چلاتے چلاتے اشرف الدین کے بازو شل ہو جاتا لیکن وہ اپنی دھن میں لگا رہتا، کیونکہ ابھی سے زمین ٹھیک نہ رکھنے سے برسات میں کاشتکاری ایک مسئلہ بن جاتی اور پھر ان سب چیزوں پر بھوک غالب ہے۔ پیٹ کی آگ وہ آگ ہے جو نہ دھوپ کی تمازت دیکھتی ہے اور نہ لو کے تھپیڑوں کی جسے پرواہ ہے!

سورج کی گرمی سے اس کا سر چکرا جاتا۔ جب وہ اپنے سر پہ ہاتھ پھیرتا تو گرم گرم بال سے اس کی ہتھیلی جلنے لگتی۔ زیادہ کام لینے سے بیل کے پاؤں لڑکھڑا جاتے۔ منہ سے جھاگ نکلتے۔ پھر بھی وہ اسے ہانک کر مزید کام لینا چاہتا۔ اس پر ڈنڈے برساتا۔ لیکن بیل اڑیل ٹٹو کی طرح آگے بڑھنے سے انکار کر دیتے۔ اس میں بھلا بوڑھے بیلوں کا کیا قصور تھا۔ انہیں تو ایک مہینہ سے کھانے کو چارا بھی نہیں ملا تھا۔

گذشتہ سال سیلاب میں کھیت ڈوب گیا تھا۔ جب دھان ہی نہیں ہوا تو پیال کہاں سے آتا کہ بیلوں کو روزانہ چارا ملتا۔ مہنگائی بڑھ گئی تھی۔ چارا دو روپے میں ملتا تھا۔ وہ اتنا مہنگا چارا خرید کر بیلوں کو

کھلانے سے معذور تھا۔

اس سال بھی اس کا ستارہ گردش میں تھا۔ سال بھر چاول خرید کر کھاتا رہا۔ اپنے گذر اوقات اور کل کی فکر سے اس کی آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

نئے دھان کے پھلنے پھولنے میں ابھی دیر تھی۔ ابھی تو صرف چیت کا مہینہ آیا تھا۔ قسمت مہربان ہوئی تو پوس میں پکے ہوئے دھان کا دیدار ہو سکتا ہے۔ پھر بھی اس شبھ گھڑی کے آنے میں دس مہینے باقی تھے۔

آفتاب گوشۂ مغرب میں چھپ رہا تھا اور شام کی دلہن اپنے رخسار پر شفق کا غازہ لگائے نمودار ہو رہی تھی۔ اشرف الدین نے کھیت کے قریب بانس اور پیال سے بنائے ہوئے "گئوشالہ" میں بیل کھونٹے سے باندھ دیئے اور ناؤ کھیتا ہوا گھاٹ پر واپس آگیا۔ پدما کے کنارے ہی غسل کرنے کیلئے دو چار ڈبکیاں لگائیں اور بھیگی ہوئی لنگی پہنے گھر آیا۔

سلطانہ نے مٹی کے برتن میں بھات اور کدّو کی بھجیا سجا کر اسکے سامنے رکھدیا۔ اشرف الدین آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور مزہ لے لے کر کھانے لگا۔ ابھی دو چار نوالے ہی حلق سے اتارے تھے کہ اچانک کسی خیال کے تحت اس نے پوچھا۔ "کیا اور بھی کچھ پکایا ہے؟"

"اور کیا پکاتی؟ دھوپ کی تمازت سے ساگ سبزی کچھ بھی نہیں ہوئی۔ دو کچے آموں کی چٹنی بنائی ہے۔" "ابھی لاتی ہوں۔"

چٹنی کے نام ہی سے اشرف کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کچھ نہ بھی ہو تو چٹنی اچار سے کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے

سلطانہ ہنڈیا سے چاول نکال نکال کر اسکے برتن میں ڈالنے لگی پھر چٹنی دیتی ہوئی بولی "ایک بات کہوں ؟"

"کیا بات ہے۔ کہو"

"کہہ تو دوں اگر تم میری بات پر عمل کرو"

"اگر مجھ سے ہو سکا تو ضرور عمل کروں گا"

"مجھے بھی ایک لال ساڑی لا دو۔ اس روز ایک لڑکی اسٹیمر سے سرخ ساڑی پہن کر اتری تھی۔ بالکل ویسی ہی ساڑی میں پہنوں گی"

اشرف کچھ سوچ کر بولا "جانتی ہو، آجکل ساڑی کی کیا قیمت ہے؟ معمولی سے معمولی ساڑی بھی پندرہ بیس روپے سے کم میں نہیں ملتی ہے۔ میرے پاس اتنے روپے کہاں کہ تمہارے ساڑی خرید کر لاؤں"

"اب تو میری زندگی خواہشوں کا مزار بن گئی ہے۔ ایک ساڑی کی خواہش کی تھی سو وہ بھی پوری نہ ہو گی" وہ منہ پھلا کر دوسری طرف بیٹھ گئی۔

اشرف الدین نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ تو دیکھا کہ سلطانہ کے چہرے پر غم و محرومی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اگر فوراً اسے نہ مناتا تو اس کی خیر نہ تھی۔ اس کے تیکھے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔

اچھی بات ہے، ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں نے انکار تو نہیں کیا۔

مگر ابھی نہیں ، پٹ سن کے موسم میں لادوں گا۔"

سلطانہ کے چہرے پر بشاشت پھوٹ آئی۔ لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی : " میں نے فوراً لانے کے لئے تو نہیں کہا ہے"

یہ کہہ کر وہ تاڑ کے پنکھے سے شوہر کو جھلنے لگی۔ اشرف نے کھانا ختم کر لیا تھا۔ سلطانہ جوٹھا برتن اٹھا کر دھونے کے لئے چلی گئی۔

۳

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ زمین کا تانبے جیسا رنگ سبزے کا لباس پہنے جنت کا سماں پیش کر رہا تھا۔ گائے ، بکریاں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ ہری بھری دوب چرنے میں مصروف تھیں۔ گھاس کھا کھا کر جب طبیعت سیر ہو جاتی تو زقندیں بھرنے لگتیں۔

اشرف الدین کے چہرے سے مسرت و انبساط کا نور ٹپک رہا تھا اس بار بر وقت بارش ہوئی تھی۔ اور بارش کا تانتا ایسا بندھا تھا کہ سارا کھیت جل تھل ہو گیا۔ سارا کھیت بورو دھان کے سبز نقش و نگار سے لہرا رہا تھا۔ پانی پی پی کر دھان کے پودے بڑھنے لگے۔ جب ہوا کے دوش پر دھان کا پودا لہراتا تو فضا میں جل ترنگ سا بجتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ کھیتوں میں سبز پریاں رقصاں ہیں۔

ابر رحمت کو دیکھ کر اس کے ہاتھ بارگاہ الٰہی کی طرف اٹھ گئے۔ کارتک کے مہینے تک دھان کی بالیاں نکل آئیں گی۔ اس کے بعد سنہرے دھان

سے سارا آنگن بھر جائے گا۔ تب سلطانہ کے چہرے سے مسرت کی سرخی جھلکے گی۔
کیونکہ اس کی دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

اساڑھ کے مہینے میں ہر سو پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔ دریا کا پانی
بھی کھیت میں در آیا تھا۔ لیکن اس سے فصل کو نقصان نہیں پہنچا۔

اس وقت جوٹ کی کاشت شروع ہو گئی تھی۔ اشرف کے پاس جوٹ
کے لئے قابل کاشت زمین نہ تھی۔ کافی دنوں سے غلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ جب تک اس
کے کھیت میں دھان پک نہیں جاتا وہ بیکار تھا۔ اس لئے اس نے دوسرے
کھیتوں میں مزدوری شروع کردی۔ گذشتہ سال سے قحط کے باعث مزدوری
بھی بڑھ گئی تھی۔ ہزاروں لوگ موت کے شکنجے میں جکڑ گئے تھے۔ اس لئے آسانی
بارہ آنے یومیہ کی مزدوری مل جاتی تھی۔ لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔
چاول کے دام بڑھ گئے تھے۔ کہیں بھی چاول بارہ آنے سیر سے کم نہیں ملتا تھا۔ اس
پر بار بار سلطانہ کی طرف سے ساڑی کے لئے یاددہانی۔ اس کی تنگدستی پر تازیانہ
کا کام کر رہی تھی۔ پاس میں اتنے پیسے نہ تھے کہ اس کی حقیر سی خواہش پوری
کرتا۔ گائے بھی سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کے تھن سے جیسے کسی نے دودھ
نچوڑ لیا ہو۔ دوسروں کے کھیت میں کام کاج کر کے جو مزدوری ملتی تھی۔ اس سے
بمشکل دونوں کے پیٹ بھرتے تھے۔ اس کا انگوچھا اتنا پھٹ گیا تھا کہ استعمال
کے قابل نہ رہا۔ انگوچھا ڈو روپے میں آتا تھا۔ مگر ادنیٰ سی خواہش کی تکمیل اسکے
بس میں نہ تھی۔ کنٹرول سے ایک لنگی خریدی تھی وہ بھی اب جگہ بہ جگہ سے پھٹ

گئی تھی۔ لیکن اسے اپنے سے زیادہ سلطانہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کی دونوں ساڑیاں اس قدر پھٹ گئی تھیں کہ اب پیوند کے قابل بھی نہ رہیں اور پھر بیچاری نے عرصہ بعد ایک خواہش کا اظہار بھی کیا تھا جو پوری ہوتی نہیں نظر آرہی تھی۔

جب بھی اسٹیمر گھاٹ پر آکر ٹھہرتی، سلطانہ حسرت بھری نظروں سے چڑھتے اترتے مرد عورتوں کو دیکھا کرتی۔ اور سوچتی کہ چند روز کے بعد اسکی حالت ایسی قابل دید ہونے والی تھی کہ وہ گھر سے باہر قدم نہ نکال سکے گی۔ کیونکہ اس کی ساڑی آخری رہائی کی بھیک مانگ کر دم توڑ چکی تھی۔ وہ جہاں جہاں سے ساڑی کی سلائی کرتی۔ وہیں سے پھٹنا شروع ہو جاتی۔ اب وہ اپنے آپ کو ابھاگن سمجھنے لگی تھی۔ ان کے پڑوسیوں کی معاشی حالت ان سے بدرجہا بہتر تھی۔ جبکہ اُس کا شوہر ان سے کم محنتی نہ تھا۔

اس نے کوئی بہت بڑی فرمائش بھی نہیں کی تھی۔ معمولی سی ایک ساڑی ہی تو مانگی تھی۔ اگر یہ حقیر خواہش پوری نہ ہوئی تو موت کے بعد کفن کا مسئلہ ایک سوالیہ نشان بنکر رہ جائے گا۔

۴

دیکھتے ہی دیکھتے کارتک کا مہینہ بھی گذر گیا۔ لیکن سلطانہ کی ساڑی خریدی نہ جا سکی۔ اس کا شوہر روزانہ ایک بار ضرور کھیت کا چکر لگاتا۔ گھر میں اناج ختم ہو چکا تھا۔ سارا مہینہ بیکاری میں گذرا تھا۔ اکثر کارتک کے مہینہ بیکاری بڑھ جاتی ہے۔ اور کسانوں کو بازار سے چاول خرید کر پیٹ کی آگ

بجھانی پڑتی ہے۔

پڑوسی سے منت سماجت کر کے اشرف الدین بمشکل دو من دھان ادھار لایا تھا۔ صرف اس شرط پر کہ پہلی فصل کٹتے ہی ان کا دھان واپس کر دے گا۔ اسی دھان سے ابتک کام چل رہا تھا۔ ورنہ فاقوں کی نوبت آجاتی مگر چند ہی دنوں کے بعد وہ ذخیرہ بھی ختم ہونے والا تھا۔ چونکہ اس سال فصل اچھی ہوئی تھی اس لئے پڑوسی نے بھی مدد کرنے میں کوئی عذر نہ سمجھا۔ مگر خدانخواستہ اس کی فصل برباد ہو جاتی تو سبھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے۔

ایک دن اس کا شوہر مسکراتے ہوئے بولا "جانتی ہو، اس سال اتنی اچھی فصل ہوئی ہے کہ گذشتہ آٹھ سالوں میں ایسا دن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ بس دو چار دنوں کی بات ہے۔ جہاں دھان پکنا شروع ہوا کھیت میں ہر سو سونا ہی سونا بکھرا نظر آئے گا۔"

پھر ذرا سا رک کر بولا "تم بے فکر رہو' اس بار میں تمہاری ساڑی ضرور لادوں گا۔ اگر نیلی چھتری والا دو چار سال اور اسی طرح مہربان ہوا تو میں تمہیں سر سے پاؤں تک سونے میں لاد دوں گا۔ اس سال دوسروں کا دھان ادا کرنے کے باوجود ہمارے پاس اتنا دھان بچے گا کہ سارا سال ٹھاٹھ کی زندگی گذاریں گے۔"

سلطانہ اس کے جواب میں مسکرا کر بولی "زیادہ دھان ملے گا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اب تو چاول کا مٹکا

بھی خالی ہو چکا ہے۔ پیٹ بھرنے کے کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی پڑے گا۔"

"بھلا دھان جو ملے گا اسے فروخت کر کے تمہارے لئے بڑھیا سی ساڑی لاؤں گا۔ تم دھان کٹّی سے دھان الگ کر لوگی نا؟ پھر تمام دھان چھان پھٹک کر سکھانا پڑے گا، تم اتنا سارا کام تنہا کر لوگی؟"

پہلے تم دھان تو لاؤ۔ اگر اکیلے کے بس کا نہ ہوا تو پڑوسنوں کو مدد کے لئے بلا لوں گی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے چند روز میں دھان پک گیا۔ سارا کھیت سنہرے رنگ میں نہا گیا تھا۔ جب کبھی آفتاب کی تیز شعاعیں، گھاس پر لپکتی ہوئی پرچھائیاں دھان کی بالیں سے دوچار ہوتیں تو اشرف الدین کی رگ رگ میں ایک انجانی کپکپی پیدا ہو جاتی اور اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ اس نے مزدوروں کو لے کر دھان کی کٹائی شروع کر دی۔ اتنا سارا دھان کاٹنا، اکیلے آدمی کے بس کے باہر تھا۔ اشرف نے کٹے ہوئے دھان کا بوجھا کشتی میں لاد کر گھر لانا شروع کیا۔ اس نے "چر" سے گھر تک کئی پھیرے لگائے۔ "چر" کے کنارے شیفالی کے اجلے اجلے پھول بڑے خوشنما لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گائے کے سفید بچھڑے دودھ پی کر آسودہ اور مطمئن بیٹھے ہوں کھلیان دھان سے اٹا پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ چاروں طرف سونا ہی سونا بکھرا ہو۔ اور رنگ اتنا پیارا تھا کہ سنار کے بنائے ہوئے زیوروں میں اتنا نکھار نہ تھا۔ اتنا سارا دھان دیکھ کر سلطانہ کا دل فرطِ مسرت سے

سے معمور ہوگیا۔ اس نے ساری زندگی میں اتنا ڈھیر سارا دھان نہیں دیکھا تھا۔ ساری فضا میں دھان کی بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا میں مستی سی چھائی ہوئی تھی اور کدّو کی بیلیں بازو پھیلا کر اپنے پھولوں کو دروازے پر جھولا جھلانے لگیں تھیں۔

اشرف الدین آخری بار کشتی لے کر "چر" پر گیا۔ شام کو ہرے بھرے درختوں کی پھنگیں خونِ شفق میں ڈوب کر پکے ہوئے سنہلے سنہلے خوشے سورج کی زرکار شعاعیں کھیلتی ہوئی سونا ہی سونا پیدا کر رہی تھیں۔ واپسی پر دھان کی گٹھریاں سلطانہ کے قدموں کے سامنے لا کر پٹخ دیں۔ سلطانہ کھلی پڑ رہی تھی۔ اشرف بھی خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا۔

"دیکھو سلطانہ! اب تمہاری برسوں کی مراد بر آئے گی۔ پڑوسنوں کو بلا کر بالیوں سے دھان الگ کرلو۔ پٹواری کو اس کا حصہ دینا پڑے گا۔"

"مطمئن رہیئے، آج رات یہ کام انجام دے دوں گی۔" سلطانہ نے کہا۔

اس خوشی میں پڑوسیوں کو بھی شامل کرنا پڑے گا۔ کیوں نہ سبھوں کو دعوت دے دی جائے۔" اشرف نے تجویز پیش کی۔

"آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ کیا کیا پکاؤں؟ مچھلی کی بریانی ٹھیک رہے گی۔" سلطانہ نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

جو تمہاری مرضی میں آئے پکا لینا۔ مگر تمہارے ہاتھ کا "میٹھا" کھائے عرصہ ہوگیا۔ کھجور کے گڑ سے "میٹھا" تیار کرو تو مزہ آجائے۔"

تقریباً ساری رات سلطانہ اور اسکے پڑوسیوں نے مل کر بالیوں سے دھان الگ کئے۔ بھوسی ایک طرف رکھکر دھان وزن کیا تو آٹھ من ہوئے اشرف نے آدھا دھان پٹواری کو بھجوا دیا۔ ایک من دھان گھر میں تین من فروخت کر دیا۔

"تم سب کے سب دھان فروخت کر دو گے تو سارا سال ہم کیا کھائیں گے؟" سلطانہ نے اسے منع کرنا چاہا۔

"سلطانہ، تم کتنی نادان ہو۔ اور بہت سارے دھان کل پرسوں تک کاٹ کر لے آؤں گا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ہمارے کھیت میں صرف اتنا ہی دھان ہوا ہے"۔ اشرف نے پیار سے ایک ہلکی چپت اسکے سر پر لگائی

اشرف الدین فروخت کردہ دھان کے بینتالیس روپے لیکر ہاٹ گیا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ جیسے ہی وہ آنگن میں آم کے درخت کے نیچے پہنچا چلانا شروع کر دیا "سلطانہ جلدی آنا"

سلطانہ فوراً گھر کے باہر آئی۔

"یہ دیکھو! تمہارے لئے کیا لایا ہوں" اشرف الدین نے سرخ ساڑی کی تہہ کھول کر سلطانہ کے سر کے چاروں طرف گھونگھٹ کی طرح لپیٹ دی سلطانہ کے چہرے پر مسرت و انبساط کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ خوشی سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

کتنے کی ہے؟ سلطانہ نے بار بار ساڑی اپنے جسم سے لپیٹ کر دیکھنا

شروع کیا۔

اری نیک بخت! تجھے آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے" وہ رگ رک کر بولا" بیس روپے سے ایک پیسہ کم ہیں نہیں ملی"

باپ رے باپ! پہلے تو یہ دس روپے کی آتی تھی" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ مگر تم اپنے لئے لنگی اور انگوچھا کیوں نہیں لائے"

سب کچھ ہو جائے گا۔ کل تک پوری فصل کٹ جائے گی۔ پھر میں شہر جاؤں گا۔ تمہارے لئے اس سے بھی اچھی ساڑی لاؤں گا۔ اور اپنے لئے لنگی اور انگوچھا بھی کچھ ـــ" اشرف الدین نے اطمینان سے کہا۔

وہ لوٹے سے پانی نکال کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ اسکی بیوی پھٹا ہوا انگوچھا لے آئی" آج کچھ حبس سی ہے" وہ گرمی سے بے چین ہو کر بولا۔

" ہاں! آج آسمان ابر آلود ہے۔ شاید اسی لئے"

مگر اس موسم میں حبس کا کیا کام؟ اس نے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کے موسم کا کیا بھروسہ، گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ"

بہر حال صبح سویرے مجھے جگا دینا، کوشش کروں گا کہ کل ہی ساری فصل کاٹ لوں۔ اور شام کے اسٹیمر سے شہر چلا جاؤں گا"

اشرف یہ کہہ کر چٹائی پر بیٹھ کر بھات کھانے بیٹھ گیا۔

دوسری شام سلطانہ اپنے شوہر کو اسٹیمر گھاٹ پر الوداع کہہ رہی تھی۔ آج اس نے سرخ ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کی ساڑی کی رنگینی آسمان کے تمام رنگوں کو شرمارہا تھا۔ اس کے چہرے سے مسرت پھوٹ پڑ رہی تھی۔ دل میں امنگوں کا ایک طوفان سا آیا ہوا تھا۔ اس کا شوہر اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے شہر جارہا تھا۔ اسکے خوابوں کی تعبیر بن کر ــــ ڈھیر ساری چیزیں جو خریدنا تھی۔ پھر بھی اس کی جدائی کا خیال اسکے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ اسٹیمر کافی دور نکل گیا اور وہ کھڑی اپنی امیدوں کے اس کارواں کو دیکھتی رہی جو پدما کی لہروں سے کھیلتا ہوا، منزل کی طرف گامزن تھا۔

رات کے پچھلے پہر زوروں کی بارش شروع ہو گئی۔ بادل کے گھن گرج سے دل کانپنے لگا۔ ہوا میں تیزی بڑھنے لگی۔ تند ہوائیں ایک مہیب طوفان کا روپ دھارنے لگیں۔ پدما کی اونچی اونچی لہریں بپھرنے لگیں۔ ایسی ہیبتناک لہریں کہ بڑے بڑے جیالوں کے دل دہل جائیں پھوس، بانس اور ٹین کے مکانات ہوا میں تنکے کی طرح اڑنے لگے۔ بڑے بڑے تناور درخت اکھڑ کر زمین بوس ہو گئے۔ یہ "سائیکلون" اپنے جلو میں تباہ کاریاں اور بربادیاں لے کر آیا تھا۔ سینکڑوں گھر اجڑ گئے۔ ہزاروں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے۔

اشرف الدین اسی رات شہر پہنچ گیا تھا۔ جب اسے طوفان

کی تباہ کاریوں کی خبر ملی تو الٹے پاؤں اپنے گاؤں بھاگا۔ اس کے گاؤں میں سب سے زیادہ تباہی مچی تھی۔ جس اسٹیمر میں وہ آیا تھا اور بھی بہت سارے لوگ امدادی وفد کی شکل میں آئے تھے۔ تاکہ مجبوروں، محتاجوں اور برباد لوگوں کی مدد کی جا سکے۔

اسٹیمر کے گھاٹ پر لگتے ہی سب سے اس کی نظر اپنے چھوٹے سے آشیانہ پر پڑی۔ مگر اب وہاں کیا رکھا تھا۔ جھونپڑی ماچس کی تیلیوں کی طرح اڑ گئی تھی۔ خالی جگہ بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ آم کا درخت سرنگوں ہو کر اپنے مالک کے سامنے شرمندہ تھا۔ اشرف الدین بھاگا بھاگا اپنے قطعہ اراضی پر گیا جہاں اس نے اپنے شریک حیات سے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد و پیماں کیا تھا۔

اس کا گھر بالکل دریا کے کنارے تھا۔ پدما نے ساحل جھونپڑیاں اور درخت توڑ پھوڑ کر اپنا پیٹ بھر لیا تھا۔ طوفان نے تمام چیزوں کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔ اشرف الدین نے نیچے نظر ڈالی کئی لاشیں ساحل کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ وہ آگے بڑھا۔ پڑوسیوں کی لاشوں کو پھلانگتا ہوا۔ وہ ایک جگہ ٹھٹھک گیا۔ سرخ ساڑی میں ملبوس سلطانہ ابدی نیند سو رہی تھی مچھلیوں اور کیکڑوں نے جگہ جگہ سے گوشت نوچ نوچ کر کھائے تھے۔ پانی میں پھول کر اس کی شکل بگڑ گئی تھی۔ لہریں سلطانہ کی بے جان جسم پر آ کر سر پٹخ رہی تھیں۔ اس سال بھی ہزاروں انسان اس پاگل دریا کے چنگل سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ اشرف الدین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہہ بہہ کر پدما کے پانی میں اضافہ کرنے لگیں۔

سانپ اور انسان

اندھیری اور خاموش رات تھی۔ رات کا سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس وقت نر سانپ نے اپنی بیوی بچوں سے کہا" دن کے وقت میں ایک مینڈک کھا رہا تھا کہ وہ حلق میں پھنس گیا۔ بڑی مشکل سے نگل سکا ہوں۔ ابھی تک گلے میں درد ہو رہا ہے اور طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔ پھر ذرا رک کر بولا۔" مگر آج اس گھر میں دھما چوکڑی کیوں مچی ہوئی ہے۔ اس اندھیری رات میں شور وغل کے درمیان ہمیں نیند کیونکر آئے گی؟"

مادہ سانپ نے جو کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ اپنے بچوں کو سلانے کیلئے سینے سے لگا لیا۔ اور پھنکار کر کہنے لگی" آج میں نے بہت آدمیوں کو اس گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔"

چھوٹی لڑکی دم ہلا کر بولی" ہاں! بہت سے چھوٹے بھی آئے ہیں۔ ایک لڑکی بہت ہی حسین ہے، جیسی کہ میں ہوں۔"

نر سانپ نے کچھ سوچ کر جواب دیا" سنا ہے کہ انسان کی ذات اچھی نہیں ہوتی۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ ان کی ذات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کی ظالم نظریں ہم پر نہ پڑیں تو اچھا ہے۔"

مادہ سانپ اونگھ رہی تھی کہ اس کا جواب سن کر کہنے لگی۔

تمہیں تو انسانوں سے خواہ مخواہ کا بغض ہے۔ کیا انسان اچھے نہیں ہوتے؟ مجھے تو اچھے خاصے لگتے ہیں۔ آخر ان میں کیا خرابی ہے؟ ایک دفعہ ایک نوکرانی اپنی پوتی کے ساتھ اس صندوق پر بیٹھی تھی جس کے اندر ہم لوگ رہتے ہیں۔ اس نے ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی۔ یہ صندوق کتنے دنوں سے اس برآمدے میں لاپرواہی سے پڑا ہوا ہے کوئی اسے چھوتا تک نہیں۔"

سانپ کا بڑا لڑکا لہراتا ہوا اٹھا۔ وہ چتکبرے رنگ کا تھا اور پھن کم از کم چار انگل ضرور چوڑا تھا۔ ماں کی بات سن کر وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ ماں! تم بہت بھولی ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ انسان کی ذات کتنی خراب ہے، تم کیا جانو! دراصل جب تم رات گئے گھر میں داخل ہوتی ہو تو وہ سوئے رہتے ہیں اور صبح کو جس دم باہر نکلتی ہو، تب بھی وہ جاگنے کے بجائے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا مزہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ان میں ہمیشہ ان بن رہتی ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ کسی کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مقتول قصوروار ہو یا نہ ہو!"

سانپ کی بڑی لڑکی چپ سادھے بیٹھی تھی۔ اس مرتبہ وہ بھی بولی "بھائی جان نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے ماں! انسان میں لالچ کا جذبہ بہت ہے۔ ہم لوگ دو چار بار شہر گئے تھے۔ وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو بلاوجہ جان سے مار دیا اور باقی تمام

لوگ یہ تماشہ کھڑے کھڑے دیکھتے رہے۔ اس کے علاوہ میں نے سنا ہے کہ یہ انسان سینکڑوں آدمیوں سے محنت مزدوری کرا کے ان کے فاقوں پر اپنے بڑے بڑے کارخانے اور لاکھوں روپے کا کاروبار چلاتے ہیں۔ وہ سونا کھاتا اور سونا پیتا ہے اور اس کے نوکر اور ان کے بچے بھوکوں مرتے ہیں ماں! مگر ہم میں تو ایسا رواج نہیں ــ ہم جتنا چاہتے ہیں جنگل میں کھا لیتے ہیں۔ ہمیں روکنے والا کوئی نہیں۔ ہم میں کوئی طبقاتی اونچ نیچ نہیں ہے ماں!"

مادہ کنڈلی مارتی ہوئی بولی "تم لوگ کچھ بھی کہو مگر مجھے ان پر بھروسہ ہے۔ ان کا اتنا بڑا جسم ہے مگر ہم لوگوں کی طرح ان میں زہر نہیں ہے۔"

" اس گھر میں آدمی بھرے پڑے ہیں، اگر ہم لوگ ان کو ڈس لیں تو ان کی کیا حالت ہوگی۔" لڑکے نے کہا

اس وقت تو وہ بے خبر سو رہے ہوں گے چنانچہ ہم چلیں اور کسی کو ڈس لیں۔"

باپ نے اس کا راستہ روک کر کہا "چھی ...... چھی .... چھی ... تمہارے دل میں اس گندے خیال نے کیونکر جنم لیا! جبتک تمہیں کوئی ستائے نہیں تم کسی کو کیوں ڈسنے لگے۔ کسی کو خواہ مخواہ نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے۔"

بڑا لڑکا بولا "مگر بابو! یہ تو بڑی ظالم قوم ہے خود اپنی نسل کی ہی دشمن ہے۔ کیا پتہ کب ہم پر وار کر دیں۔"

باپ لڑکے کے خیالات سے حیران رہ گیا۔ اس نے کہا "ہمیں ان سے

کیا فائدہ .... ؟ وقت خود ظالموں سے بدلہ لے لیگا۔ ہمیں اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس کی ماں تنگ ہو رہی تھی۔ جھنجھلا کر بولی "جانے بھی دو رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب سو جانا چاہیئے۔ دیکھو بیٹا! غصہ میں کسی کو مت ڈسنا۔ وہ لوگ بھی یہیں رہتے ہیں اور ہم لوگ بھی۔ اس لیئے لڑائی جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ؟"

پھر وہ لوگ بہت جلد بے خبر سو گئے۔

سانپوں کا یہ خاندان علی الصباح اٹھ بیٹھا۔ باپ بڑے اور ہوشیار لڑکے کو ہمراہ لے کر باہر چلا گیا۔ ان کی ماں تین چھوٹے چھوٹے بچوں اور انڈوں کو سینے سے لگائے وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں نئے نئے خیالات آنے لگے۔ یہ انڈا کب پھوٹے گا اور بچے کب چلنے پھرنے لگیں گے؟ "انسان کے لڑکے کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ وہ ماں کو چھوڑ کر کھیلتے کودتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچے ہر وقت ماں ماں کرتے اور ہمارے پاس گھسے رہتے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب ہو کہ میں ان سے الگ رہ سکوں۔"

سوچتے سوچتے وہ سر نیچے کر کے بچوں کو چاٹنے لگی۔ چونکہ رات کے وقت اچھی طرح سو نہ سکی تھی۔ اس لئے اونگھتے اونگھتے سو گئی۔

وہ کھٹ کھٹ کی آواز سن کر جاگ پڑی۔ وہ اپنا پھن اٹھا کر ڈھکن کی طرف تکنے لگی۔ ایک آدمی صندوق کا ڈھکن تھوڑا سا اٹھا کر اندر دیکھ رہا تھا

جیسے ہی اس کی نظر سانپ پر پڑی ۔ صندوق کا ڈھکن اسی طرح چھوڑ کر چلاتا ہوا بھاگا ۔ اس کی آواز سن کر بہت سے آدمی جمع ہو گئے ۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ صندوق کے اندر سانپ ہے ۔ تو انہوں نے ہاتھوں میں ڈنڈے لیکر بکس کو چاروں طرف سے گھیر لیا ۔

انہیں ڈنڈے لئے دیکھ کر مادہ کا دل دھک دھک کرنے لگا ۔ اس نے جلدی سے اپنے بچوں کو اپنے نیچے چھپا لیا اور پھن اٹھا کر سیدھی کھڑی ہو گئی ۔ اس کا پھن کم از کم دس انگل چوڑا تھا ۔ وہ بار بار زبان نکال کر صندوق کے اندر جھومنے لگی ۔

صندوق کا بند ڈھکن تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کیسے بھاگ جائے ۔ ایک ماں اپنے بچوں کو موت کے منہ میں اکیلا کیسے چھوڑ سکے گی ۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اپنی زبان میں آدمی سے مخاطب ہو کر بولی " اے لوگو! ہمیں مت مارو ۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے تم اشرف المخلوقات ہو ۔ اپنے اشرف اور افضل ہونے کا ثبوت دو ۔ ہمیں مت ستاؤ "

آدمیوں نے صندوق کا ڈھکن دور سے پکڑ کر اٹھایا ہی تھا کہ وہ ٹوٹ کر مادہ کے سر پر گرا ۔ اسے گہری چوٹ آئی ۔ وہ درد کی شدت سے بے تاب ہو کر اپنا سر صندوق کی دیوار پر پٹخنے لگی ۔ بچے ڈر کر اور بھی

پیٹ کے اندر سما گئے۔

وہ خوف اور کسی قدر حیرت زدہ ہو کر اپنی چمکیلی آنکھوں سے انہیں گھورنے لگی اور سانپوں کی زبان میں بولی "تم لوگ آج مجھے بڑی آسانی سے مار سکتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ سانپ کو مار کر فاتح اعظم کہلاؤ گے! شاید تم نہیں جانتے کہ آج میں بچوں کے پیار کی وجہ سے مجبور ہوں۔ ورنہ میں کبھی کی، اس سوراخ کے راستے رفو چکر ہو چکی ہوتی یا تمہیں ڈس کر جہنم رسید کر دیتی۔ اگر میں ایک بار پھر باہر نکل کھڑی ہوؤں تو ہے تم میں مائی کا لال کہ میرے مقابل ٹھہر جائے۔؟"

"کھٹا کھٹ! کھٹا کھٹ!"

مادہ کے سر پہ ڈنڈوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا اور بدن اینٹھنے لگا اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اور دنیا میں ماں کے پیار کا نشان پھر بلند ہو گیا۔!!

سانپ کے پانچ ہاتھ لمبے جسم کو کھینچ کر صندوق سے باہر نکالا گیا۔ بچے کلبلا کر اٹھے اور اپنی زبان میں یہ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ "ماں! ماں! ہم اب کیسے زندہ رہیں گے ماں!"

وہ صندوق میں کلبلا رہے تھے کہ ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو ان کی ماں کا ہوا تھا۔ دور فضا میں شیطان، انسان کی جہالت پر قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا اور ظالم انسان مسکرا رہا تھا۔

رات کے وقت جب نر سانپ اپنے لڑکوں کے ساتھ واپس آیا تو اپنے صندوق نما گھر کو وہاں نہیں پایا۔ لڑکے چیخ مار کر رونے لگے۔ "ماں! ماں!"

سانپ کا بڑا لڑکا روتا ہوا بولا۔ "ظالم انسان نے ضرور ہماری ماں اور بھائی بہنوں کو مار ڈالا ہے۔ وہ انسان کے بھیس میں شیطان ہیں۔ ظاہر میں شریف اور باطن میں بھیڑیا۔"

صندوق کو توڑ پھوڑ کر ایک کنارے پھینکدیا گیا تھا۔ اچانک سانپ کے بڑے لڑکے نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے اشارے سے اپنے باپ کو صندوق دکھایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

باپ نے وفور الم سے رو پڑا۔ غیظ و غضب سے وہ پھن اٹھائے ہوئے دم کے بل کھڑا ہوگیا۔ جذبۂ انتقام سے اس کا منہ تمتما اٹھا۔ وہ پھنکار کر اپنے لڑکوں سے کہنے لگا۔

"دیکھا تم نے انسان کے کرتوت؟ کتنے ظالم ہیں یہ؟ ہمارا چھوٹا سا خاندان کیسی ہنسی خوشی اور آرام سے زندگی گذار رہا تھا۔ مگر انہوں نے ہمیں برباد کر دیا۔ انسان کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے بچے میرے سامنے سے گذر جاتے تھے۔ مگر میں انہیں نہیں ڈستا تھا۔ کیونکہ وہ معصوم اور بے قصور ہوتے تھے۔ مگر اب تم انسان کی طرف دوستی کی نگاہ سے مت دیکھنا۔ کل رات تمہاری ماں نے تمہیں آدمیوں کو ڈسنے سے روکا تھا تو دیکھا اسے اس کا کیا پھل ملا؟ تم لوگ اب کہیں اور جا کر رہ سکتے ہو لیکن میں یہیں رہوں گا اور دیکھوں گا۔

کہ میں انہیں رلا سکتا ہوں یا نہیں!" یہ کہہ کر وہ غیظ و غضب میں اپنا پھن زمین پر مارنے لگا۔

وہ ایک ہفتہ تک وہیں رہا مگر کسی آدمی کو نہ پا سکا۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ملے تھے۔ مگر انہیں ان سب سے کیا واسطہ؟ وہ معصوم بچے کسی کو ستانا کیا جانتے تھے جو وہ انہیں ڈستا۔ وہ دوسرے کے بچوں کو کیوں ڈسے؟ جبکہ اس کے بھی بچے تھے!!

ایک رات بارش ہوئی۔

آسمان خوشنما نظر آ رہا تھا۔ فضا میں موسیقی گھلی ہوئی تھی۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے سبز گھاس پر موتی کی مانند چمک رہے تھے۔ پودے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ پھول مسکرا رہے تھے ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ وہ سبز سبز گھاس پر رینگتا ہوا، تالاب کے کنارے آ پہنچا۔ پھول کی خوشبو سے وہ جھوم اٹھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد وہ بہت غمگین رہا کرتا تھا۔ لیکن آج خوش نظر آ رہا تھا۔

وہ پودے کے قریب جا بیٹھا۔ پھول کی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے دل میں سکون محسوس کرتے لگا۔ اس نے سوچا "قدرت نے بھی اس دنیا میں کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں۔ کہیں خوشی کہیں غم! ہم لوگوں کی چند روزہ زندگی ہے۔ پھر ہم دوسروں کو کیوں ستائیں؟ اب میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا۔ جو مر گئے انسو مر گئے۔

وہ مرنے کے بعد آرام ہی سے ہوں گے اور پھر مجھے بھی تو کسی نہ کسی دن وہاں جانا ہے!!"

اچانک اسے پھول کے پودے کے قریب دو انسانی پاؤں نظر آئے اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک نمودار ہوئی اور پھر آپ ہی آپ غائب ہو گئی۔

وہ اپنے پھن کو جھٹک کر بڑبڑایا۔ نہیں

"نہیں۔ اب میں کسی کو نہیں ڈسوں گا!"

بادل کا سایہ

دریائے کرنافلی کے کنارے جدید طرز کا ایک بنگلہ "شبانہ" تھا جب شام کو سیر و تفریح کرنے والے دریا کے کنارے ٹہلنے کے لئے آتے تو انکے ذہن میں یہ خیال پھر چکر لگانے لگتا کہ ایسی سنسان اور ویران جگہ پر آخر یہ مکان بنانے کی کیا تک ہے؟ ایسا دلکش اور شاعرانہ نام رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ نام کی تختی پر رہائش پذیر کا نام "مسز روبینہ چودھری" درج ہے۔

اس بنگلے کی پر اسرار مالکن لوگوں کی گفتگو کا مرکز تھی۔ کسی کا یہ خیال تھا کہ وہ اپنے ضدی، ظالم، چڑچڑے اور شکی مزاج شوہر سے دامن چھڑا کر بھاگ آئی ہے۔ کوئی کہتا کہ اس کے شوہر نے کسی حسین و جمیل لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس لئے وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ کسی کا کہنا تھا کہ وہ بیوگی کی زندگی کی بجائے ایک بیاہتا عورت کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن کسی کو بھی حقیقت کا علم نہیں کہ لوکل اسکول کی مسٹریس مسز روبینہ چودھری کی پچھلی زندگی کیونکہ سب کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

دریائے کرنافلی کے کنارے ایک بانکا سجیلا نوجوان ٹہل رہا تھا۔

جب ٹہلتے ٹہلتے اس بنگلے کے قریب سے گذرا تو نام کی تختی پڑھکر چونک پڑا۔ گھر کا نام بہت ہی پرکشش اور شاعرانہ ہے۔ مگر یہاں رہنے والے شخص کا نام اس سے بھی زیادہ پرکشش اور حسین ہے۔ میرے دل اور میرے ذہن پر جس کا نام نقش ہے کہیں وہ حسینہ یہی تو نہیں۔ جس نے میرے دل و دماغ کے سکون کو چھینا ہے۔ یہ سوچتے ہی اسکے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔

شام کا سہانا وقت تھا۔ روبینہ کی یہ زندگی بظاہر کافی آرام دہ اور پرسکون تھی۔ مگر یہ پہاڑ ایسی زندگی تنہا کس طرح کٹے؟ کنول جیسی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کے تارے جھلملانے لگے۔ اس کا دل اداس ہو گیا۔ آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ سائڈ ٹیبل کا لیمپ جلالیا تاکہ شام کی ہلکی ہلکی تاریکی کسی قدر دور ہو جائے۔ اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ جھنجھلائی ہوئی اٹھی اور دروازہ کھولنے کے لئے بڑھی "کون ہے؟"

"میں۔" مختصر سا جواب ملا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس کے کان اس آواز سے مانوس ہیں۔ اس احساس سے وہ گھبرا سی گئی۔

دو سال سے اس کے کان یہ آواز سننے سے محروم تھے۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ سالہا سال سے وہ اس آواز کو سننے کے لئے ترس گئی۔ اس خیال سے دل میں مسرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا مگر شاہد کو دیکھتے ہی مسرت کی لہر ڈوب گئی۔ وہ روبینہ کی درخواست پر کرسی

پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ اس کی پژمردہ نگاہیں باہر آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے روبینہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"حضور کو کیسے پتہ چلا اور کیسے میرے گھر پر دھاوا بول دیا؟"

روبینہ کے اس سوال پر وہ تصور کی دنیا سے واپس آگیا۔ "بیرونِ ممالک جانے سے پہلے یہاں اپنے ایک دوست کی دعوت پر آیا تھا۔ دعوت سے فارغ ہوا اور ڈاک بنگلہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اب شام ہوئی تو ٹہلنے لگا تو یہ گھر میرے لئے کشش کا باعث بن گیا۔

"بیرونِ ملک جانے کی خبر سن کر روبینہ نے اس سے پوچھا۔" اپنا ملک چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟"

"انگلستان میں ایک اچھی سی نوکری مل گئی۔" یہ کہتے کہتے وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کی بیوی بھی اپنے اعزّ و اقربا کو چھوڑ کر ساتھ جانے کیلئے تیار ہوگئی۔"

اس وقت تک وہ دروازہ سے گذر کر سیڑھی تک پہنچ چکا تھا۔ وہیں سے اس نے نہایت ملائم لہجے میں جواب دیا۔ تنہائی کی زندگی بسر کرنے والے کیلئے یہ سوال غیر ضروری ہے۔"

اچھا، تو تم نے روبی کے ساتھ بھی بے وفائی کی اور اس سے شادی نہیں کی۔" وہ غصے سے کانپنے لگی۔

شاہد نے اس کی طرف ایک غمگین نظر ڈالی اور جواب دیئے بغیر

چلا گیا۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی بستر پر آن گری۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہنے لگا۔ اتنے عرصے کے بعد شاہد سے ملاقات بھی ہوئی تو وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔ چند ہی دنوں میں وہ اس کی آنکھوں سے دور ہو جائے گا۔ شاہد سے جدا ہونے کے بعد وہ کبھی یہ سوچ نہیں سکتی تھی کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ دو سال پہلے کی تمام باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ جس کی یاد کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھنے لگی۔

روبینہ اور شاہد دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔ شادی کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ سہاگ رات کے علاوہ اور کسی دن نہیں ملیں گے۔ اچانک شادی سے تین دن پہلے دوپہر کے وقت روبینہ شاہد کے گھر جا پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو ہونے والی مالکن کو اپنے سامنے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "صاحب تو ابھی نہیں ہیں۔ کچھ دیر میں آجائیں گے۔ اس وقت تک آپ اندر انتظار کریں۔"

روبینہ شاہد کے کمرے میں داخل ہوئی۔ میز پر ایک مجلد کاپی رائٹنگ پیڈ پر الیسٹرے اور رجنی گندھا کا گلدستہ پڑا تھا۔ رجنی گندھا روبینہ کا پسندیدہ پھول تھا۔ یہ پھول اس نے اس کو تحفہ دینے کے لئے خریدا ہو۔ مسرت سے اس کا دل معمور ہو گیا۔ وہ پھولوں کو اپنے رخساروں

سے لگاکر شرماسی گئی۔ گلدستے میں پن سے ایک کارڈ لگا ہوا تھا، لکھا تھا۔
رجنی گندھا کی لطیف وسفید "روبی" کو میری طرف سے یہ حقیر تحفہ۔

روبینہ کا رنگ سانولا تھا۔ اس رنگ کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ ملیح ہے۔ سفید نہ ہونے کے باعث اسے رجنی گندھا سے تشبیہہ نہیں دی جاسکتی۔ تب وہ ضرور "روبی" نام کی کسی خوبصورت لڑکی سے محبت کرتا ہوگا اس خیال سے اس کے دل ودماغ میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا۔ اس نے غیر شعوری طور پر کاپی کھولی۔ پتہ چلا کہ شاہد اچھا خاصا شاعر بھی ہے اور بڑے عمدہ اشعار موزوں کرلیتا ہے۔ ابھی اس نے چند ہی نظموں کا مطالعہ کیا تھا کہ اسے ہر چیز دھندلی دھندلی سی دکھائی دینے لگی۔ روبی کو مخاطب کرکے اکثر نظمیں لکھی گئی تھیں۔ روبی کے نام کا آبشار تمام نظموں میں رواں دواں تھا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ مرد بیک وقت کئی عورتوں سے محبت کرتا ہے۔ اسے اس بات کا یقین آج ہوگیا۔ گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ بیگ کھول کر پن نکالا۔ میز پر سے رائٹنگ پیڈ اٹھاکر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھنے لگی۔

" شاہد!
میں آج تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو رہی ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی بیکار کوشش نہ کرنا۔ شاد وآباد رہو۔

فقط
روبینہ "

میز پر پیڈ رکھکر جب باہر نکلنے لگی تو فریم کی ہوئی شاہد کی تصویر پر نظر پڑی۔ اس نے تصویر نکال کر اطمینان سے اپنے وینٹی بیگ میں رکھ لی اور باہر نکل آئی۔ شاہد روبینہ سے بے وفائی کر سکتا ہے۔ مگر روبینہ اسے کیسے بھلا سکتی تھی؟

اس نے اس دن وہ شہر ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا اور اپنی ایک بڑی عزیز سہیلی کے پاس چلی آئی۔ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ نہ والدین تھے نہ کوئی اور رشتہ دار۔ تنہائی کی اس زندگی میں اسے خوشی کی چند گھڑیاں ہی ملی تھیں کہ محبت کا روگ لگ گیا۔ زندگی کے کسی بھی روپ میں اپنے آپ کو ڈھالنے لینے کی اس میں صلاحیت تھی۔ بینک میں اس کے کچھ روپے تھے۔ جو اس کی زندگی کے سہارا تھے۔ چند مہینوں میں اس کی پسند کا "شبانہ" تیار ہو گیا۔ اور اسے ایک مقامی اسکول میں مسٹریس کی نوکری بھی مل گئی۔ یہاں سے اس کی تنہا اور خاموش زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

دو سال کا عرصہ گذر جانے کے بعد شاہد اس کی ٹوہ لگاتا ہوا ملاقات کرنے کیوں آیا۔ اور پھر غیر شادی شدہ ہونے کا اظہار کرنیکی کیا ضرورت تھی ہاروبی سے بھی شادی نہیں کی۔ یہ تمام خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کٹ گئی۔ سحری کے وقت کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا جب اس کے گالوں سے مس کرتی ہوئی گذری تو وہ اٹھ بیٹھی۔ نسیم صبح سے لطف اٹھانے

کیلئے وہ باہر نکلی تو دیکھا کہ سیڑھیوں پر رجنی گندھا کا ایک گلدستہ پڑا ہوا تھا۔ وہ یہاں کیسے آیا۔؟

یہ حرکت کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جو روبینہ کی پسند سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ روبینہ رجنی گندھا پر مرتی ہے۔ بے وفا شاہد سے ایسی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ یونہی بے ارادہ اس نے گلدستہ اٹھایا۔ مگر اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ جس پر ایک مانوس نام مرقوم تھا۔ "روبینہ"

اس خط کی آخر کیا ضرورت تھی۔ اس خیال سے اس کا دل گھبرانے لگا۔ جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ جس نام سے اسے مخاطب کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی چونک پڑی اور پورے انہماک سے جلدی جلدی خط پڑھنے لگی۔

"پیاری روبی!"

سب سے پہلے میں تم سے اس نئے تخاطب پر معافی مانگ رہا ہوں۔ جو نام ہمیشہ میرے دل میں نغمہ ریز رہا۔ آج تمہیں بتا رہا ہوں۔

سنو! تمہارے جانے کے دو سال بعد تک میں نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ جب بھی تنہائی نصیب ہوتی ہے۔ تمہیں نہ پا سکنے کا خیال دل میں ایک درد سا پیدا کرتا ہے۔ تمہاری محبت اب تک مجھے سہارا دیتی رہی ہے۔ ورنہ کئی بار جی میں آیا، خودکشی کر لوں۔ آخر اس دنیا میں کیا رکھا ہے

دکھ اور غم کے سوا، تمہاری دوری بھی میرے دل میں محبت کے احساس کو جگاتی رہی ہے۔

آج مس روبینہ مسز چودھری کے نام سے مشہور ہے۔ اب تمہیں پانے کی جستجو فضول ہے۔ تم نے اب جس کا سہارا ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ تمہیں زندگی کی مسرت ضرور بہم پہنچائے گا۔ میری یہی دعا ہے کہ تم سدا خوش رہو۔

اپنی گمشدہ تصویر دیکھ کر نہ صرف حیرت ہوئی۔ بلکہ افسوس بھی ہوا۔ جس محبت کی متلاشی کو دل سے چاہ نہ سکی اس کی نشانی اپنے پاس رکھنے سے کیا فائدہ؟ ہمیشہ کے لئے دور ہونے سے پہلے اس امید پر گلدستہ نذر کرتا ہوں۔

فقط
شاہد چودھری

خط پڑھکر بادل کا سایہ اسکے پر رونق چہرے سے ہٹ گیا۔ روبینہ کے دل میں امید کی مہتابی کرن جھلملانے لگی۔ اس نے سوچا فوراً ہی جاکر شاہد سے مل لینا چاہیئے۔ مگر اس خط میں شاہد کا پتہ درج نہیں تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ڈاک بنگلے کا خیال آیا۔ وہ ڈاک بنگلہ پہنچی۔ بھیا کھ کی کالی گھٹا کی طرح تیز رفتاری سے وہ ڈاک بنگلہ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا۔ شاہد رخت سفر باندھے چلا آرہا تھا۔ دھیمی اور پیار بھری آواز میں اس نے پکارا۔

" روبینہ تم! یہاں ؟" اس نے متحیر ہو کر پوچھا۔

تم میرے ساتھ جاؤ گے یا مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جاؤ گے ؟"

" کیا کہہ رہی ہو روبینہ! اب تو یہ ناممکن ہے۔ بھلا چودھری صاحب تمہیں کیوں جانے دیں گے ؟"

میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ روبینہ بولی " شاہد چودھری اگر اپنی روبی کو ساتھ لے جائے تو کون روک سکتا ہے "

شاہد چودھری حیرت سے اسکی طرف دیکھنے لگا۔

روبینہ پھر بولی " تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے بغیر کسی ادائیگی رسم کے گذشتہ دو سال سے تمہیں اپنا شوہر تسلیم کر رکھا ہے "

" اگر ایسا ہے تو تم مجھ سے چھپ کر یہاں کیوں رہ رہی تھیں اور اپنے آپ کو مسز چودھری کے نام سے کیوں مشہور کر رکھا ہے، آخر یہ مسٹر چودھری کون ہیں ؟"

روبینہ بولی " تمہارے نام کا آخری حصہ اپنے نام کے ساتھ لگانیکی آرزو مدت سے میرے دل میں تھی۔ اس سے مجھے ایک تسکین سی ملتی تھی۔

" مگر تم میرے پاس سے کیوں بھاگ آئی ؟"

شادی کے تین دن پہلے تمہارے گھر میں رجنی گندھا کا گلدستہ رکھا تھا، پاس ہی تمہاری بیاض پڑی تھی۔ جس میں روبی کا لفظ بڑی محبت سے لکھا ہوا تھا۔ میں یہ نہ جان سکی کہ روبی میرے نام

کا مخفف ہے۔ میں سمجھی تمہاری کوئی محبوبہ ہے۔ اچانک غلط فہمی کے سائے دل و دماغ پر مسلط ہو گئے۔ اور میرے احساس و شعور کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج وہ بادل چھٹ گئے ہیں۔"

دھرتی کو آکاش پکارے

غریبوں کی آدھی بستی توڑ کر ایک عظیم الشان تین منزلہ عمارت بنادی گئی تھی۔ اس کوٹھی کے کمپانڈ میں رنگ برنگے پھولوں کا باغیچہ، مصنوعی پہاڑ سے بہنے والا آبشار، پنجرے میں قسم قسم کی چڑیاں، درمیان میں حوض کے اندر فوارہ بنا ہوا تھا۔ بقیہ بستی میں مزدور رہا کرتے تھے۔ جو سرشام ہی سو جانے کے عادی تھے۔ البتہ کبھی کبھار رات میں سیٹھ امین الزماں چودھری کی شیورلیٹ تاریکی کے سینے کو چیرتی ہوئی نکلتی تو چند لمحے کیلئے برہوں سناٹے میں خلل سا پڑ جاتا۔

ایک دن چودھری صاحب کا لڑکا ساجد جسکی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر لوہے کے گیٹ پر پڑی۔ بستی کا ایک ہم عمر لڑکا میلے کچیلے کپڑے میں ملبوس، باہر کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے کوٹھی کی طرف تک رہا تھا۔

"کیا چاہیئے؟" ساجد نے اس سے پوچھا۔

"میں.... میں۔ ۔ دیکھ رہا ہوں"۔ لڑکے نے بمشکل کہا۔

وہاں کیوں کھڑے ہو . . . اندر آجاؤ"۔ ساجد نے صدر گیٹ

کھول کر اسے اندر بلایا۔ "آؤ۔"

لڑکا بڑا متعجب ہوا۔ وہ اطمینان سے اندر چلا آیا۔ ساجد اسے اپنے والد کا کل اثاثہ دکھانے لگا۔ "وہ دیکھو گلاب کے پھول۔۔۔۔ نقلی پہاڑ۔۔ وہ دیکھو ہرن اور یہ شیشے کے مرتبان میں رنگ برنگی مچھلیاں۔۔۔۔"

وہ لڑکا جیسے طلسم ہوشربا کی سیر کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے حیرت کے مارے بات نہیں نکل رہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"ساجد!" دوسری منزل سے چھوٹی باجی کی آواز آئی۔ اس نے مڑکر اوپر کی طرف نظر دوڑائی اور کہا۔ "آتا ہوں۔" پھر اس لڑکے سے مخاطب ہوا۔ "ڈرنا نہیں۔۔۔۔۔ میں ابھی آیا۔ تم سب کچھ دیکھتے رہو۔"

ساجد اوپر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر تفکر اور خوشی کے ملے جلے آثار نظر آ رہے تھے۔ اسے اس روز بالکل نیا فٹ بال ملا تھا۔ نوکروں کے ساتھ کھیلنے سے اس کی طبیعت نہیں لگتی تھی۔ وہ تو اپنی عمر کا ایک ساتھی چاہتا تھا۔ چھوٹی باجی اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑے مزے سے کھیلا کرتی تھی۔ بس اسی کا ہی کوئی ساتھی نہ تھا۔

"تم ابتک تیار نہیں ہوئے۔" چھوٹی باجی بولی۔ سوئیلو بھیلنے ابھی ابھی فون کیا تھا۔ وہ فلم دکھانے کیلئے آ رہے ہیں۔ سوئیس فلم ربنسن (ROBINSON) چل رہی ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" ساجد نے سر کو نفی میں ہلا کر کہا۔

"کل سے بھیا کو کہہ رکھا ہے۔ جائے گا کیوں نہیں۔ نواب کہیں کا!"

چھوٹی باجی نے دھمکی دی۔

"مجھے فلمیں اچھی نہیں لگتی ہیں"

اچھی نہیں لگتی تو کیا ہوا؟ میں جو کہتی ہوں.... "چھوٹی باجی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

چھوٹی باجی عمر میں ساجد سے چار سال بڑی تھی۔ اپنے سے چھوٹوں پر حکم چلاتے ہوئے اسے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ اگر چھوٹا اس کا حکم نہیں مانتا تو آگ بگولہ ہو جاتی۔ اور اسکے عوض گھونسہ لات تھپڑ کی بارش شروع ہو جاتی۔

بہر حال اسے سینما کے لئے تیار ہونا ہی پڑا۔ بڑے کا حکم! جب وہ لباس تبدیل کر کے نیچے اترا تو اس نے بڑا دل خراش منظر دیکھا۔ اس کا نوکر رمجو، اس غریب لڑکے کی گردن پکڑے دھکے دیکر گیٹ سے باہر نکال رہا تھا۔ ساجد کو بڑا غصہ آیا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس گیا اور بولا "رمجو! ۔ ذلیل۔ ۔ کمینے ۔ تو اسے دھکے دے کر کیوں نکال رہا ہے؟"

"چھوٹے بابو! یہ دوسروں کی آنکھ بچا کر اندر گھس آیا تھا۔ یہ دیکھئے اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھول... ضرور اس نے توڑے ہوں گے"

غصے سے ساجد کی آنکھیں سرخ ہو گئیں "نہیں۔ میں نے ہی اسے اندر آنے کے لئے کہا تھا۔ اور میں نے اسے یہ پھول توڑ کر دیئے تھے!"

وہ لڑکا گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ ساجد جھپٹ کر گیٹ کی طرف بڑھا

رمجو ایک طرف ہٹ گیا۔ ساجد نے گرے ہوئے پھول اٹھا کر اسے دیئے۔ "لے لو .... میں تمہیں دے رہا ہوں۔"

دوسری صبح ساجد دوسری منزل کے مغربی برآمدے میں کھڑا تھا چہار دیواری کے ساتھ والے جھونپڑے کے باہر وہ لڑکا لکڑی کا ٹوٹا ہوا گھوڑا، بید کی ٹوکری اور پلاسٹک کی مڑی تڑی گڑیا سے کھیل رہا تھا۔

ساجد تمام چیزوں کو پہچان گیا تھا۔ کیونکہ یہ سب چیزیں کوڑا کرکٹ سمجھ کر ان لوگوں نے گیٹ کے باہر پھنکوا دی تھی۔ اب وہ بیچارہ ان چیزوں کو بڑی حفاظت سے رکھے کھیل رہا تھا۔ ساجد کے لیے جو چیز بے کار تھی، وہ اس کے لیے کار آمد تھی۔ اس کے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی۔ اس نے سوچا کہ میں جب بھی کسی چیز کی خواہش کرتا ہوں۔ فوراً پوری کر دی جاتی ہے اور اس کی یہ آرزو چند روزہ ہوا کرتی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی طبیعت بھر جاتی تھی۔ اور اسے دوسری چیز کی تمنا ستانے لگتی۔ اور اس کا ہر ارمان پورا بھی کیا جاتا۔ مگر افسوس کہ وہ غریب اس کے مقابلے میں کتنا لاچار و مجبور تھا۔

شام کو ساجد اپنے نوکر کے ہمراہ گھوم پھر کر واپس آ رہا تھا تو دیکھا کہ وہی لڑکا لکڑی کے ٹوٹے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر تختہ جوڑ کر بیٹھا، سواری کر رہا تھا۔ "چل میرے گھوڑے چل" منہ ٹوٹا ہوا گھوڑا ہم نے پھینک دیا تھا اسی گھوڑے کو لے کر ڈینگیں مار رہا ہے۔" رمجو نے ہنس کر کہا۔

ساجد نے غصیلی نظروں سے رمجو کو دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں

کہا۔ گھر آنے پر اسے خیال آیا کہ اس کا بڑا گھوڑا نوکر کے کمرے میں بیکار پڑا ہے... جلد کا رنگ اڑ گیا ہے۔ گردن میں ایال نہیں تھا۔ بس ایسے ہی پھینکا ہوا تھا ...... وہ گھوڑا اگر؟ ......

رنجو کو فوراً حکم دیا۔ "وہ گھوڑا لے چل ...... اسے دوں گا۔"

یہ سن کر رنجو جل ہی گیا۔ چند دنوں سے وہ اس چکر میں تھا کہ یہ گھوڑا نکڑ والی دکان میں فروخت کر دے گا۔ ان سے بات بھی پکی ہو چکی تھی۔ چار روپے قیمت طے ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑا اب تک صرف اس لئے نہیں بیچا تھا کہ دوسری جگہ مول تول کر لے۔

"چھوٹے بابو! وہ گھوڑا لے کر کیا کرے گا؟"

"جو کچھ بھی کرے ...... لے چل ...." ساجد نے اسے جھاڑ سنائی۔

رنجو کو معلوم تھا کہ امیر باپ کا بیٹا اپنی ضد پوری کرتا ہے۔ چنانچہ اسے گھوڑا دے آنا پڑا۔ تحیر کی وجہ سے لڑکے کے منھ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ وہ تو جیسے اپسراؤں اور پریوں کے دیس میں گھوم رہا تھا۔ جو چیز وہ منھ کھول کر مانگ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ راجا بابو اس کے ہاتھ میں یونہی دے دیتے ہیں۔

شام کو ساجد تین پہئیے کی سائیکل کمپاؤنڈ کی سڑک پر چلا رہا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"راجا بابو!"

نظر دوڑائی۔ پیٹ پر وہی لڑکا نظر آیا۔

ساجد جا کر ملا۔ مٹھی کھولکر لڑکے نے کہا" چڑیا کا بچہ لوگے؟"

"کونسی چڑیا؟"

" مینا۔ پانچ چھے پرورش کی ہے۔ بچہ ہوا ہے، کاٹے گا نہیں؟

"نہیں۔ پنجرہ کی ضرورت پڑے گی۔"

پنجرہ کے اندر تم خود چھوڑ دینا۔ اچھا اب اندر آجاؤ۔ وہ رہا پنجرہ . . . . ."

ساجد لڑکے کو لے کر پنجرہ کے پاس آیا۔ مالی کو بلایا، بولا" پنجرہ کے اندر رکھو . . . مینا کے بچہ کو۔ ۔"

بڑے بابو ناراض ہوں گے۔ جنگلی مینا کہیں پنجرے میں پرورش پاتی ہے! مالی نے کانوں کو ہاتھ لگایا"نہیں رکھوں گا" یہ میری مینا ہے۔"

مالی کو اور مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے مینا کے بچے کو پنجرے میں رکھ دیا۔

" تمہارا کیا نام ہے؟" ساجد نے اس سے پوچھا۔

" شوکت"! ویسے گھر میں سب مجھے ٹوٹو کے نام سے پکارتے ہیں۔"

" میرا نام ساجد ہے، تصویریں دیکھوگے۔ آؤ . . . کل تصویروں کی نئی کتاب خرید کر لایا ہوں۔ ایروپلین کی تصویر ہے . . . . جنگی جہاز کی تصویر ہے۔"

ساجد، شوکت کو لے کر ریڈنگ روم میں آیا۔ تصویروں کی کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھی پھر پوچھا۔

" چاکلیٹ کھاؤ گے ؟"

شوکت نے زندگی میں چاکلیٹ کا نام ہی نہیں سنا تھا۔ متعجب ہو کر ساجد کی طرف دیکھنے لگا۔ ساجد نے چاکلیٹ لاکر دی [illegible]ت نے منہ میں رکھا۔ وہ بہت ہی عمدہ اور مزے دار تھا۔

" شوکت نے کہا۔" میں بھی تمہیں ایک چیز کھلا سکتا ہوں۔"

" کیا ؟"

" آم سٹ۔ میری ماں عمدہ آم سٹ بناتی ہے۔ وہ بازار میں آم سٹ بیچتی ہے۔ جو کھانے میں بہت لذیذ ہے اور سونے کی طرح اس کا رنگ ہوتا ہے۔ کھاؤ گے ؟"

" ہاں، کھاؤں گا۔"

" لے آؤں ؟" یہ کہہ کر وہ فوراً گھر واپس آیا۔ اور اپنے ساتھ کافی آم سٹ لے آیا۔

ساجد نے آم سٹ کھایا۔ اتنی عمدہ چیز پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ چھوٹی بہن نے آواز دی

بولا " میں آرہا ہوں۔ تم یہاں بیٹھ کر کتابیں دیکھو۔"
شوکت کے ہاتھ میں کتاب دے کر دوسری منزل پر گیا۔ آواز دی۔

"کیا ہوا رے؟"

"آم سٹ کھاؤ گی یہ بہت لذیذ ہے۔"

"واقعی — لاؤ ...... چھوٹی باجی نے آم سٹ کھایا، "یہ بہت مزے دار ہے۔ کہاں سے لائے؟"

"میرے دوست نے دیا ہے۔"

اچانک نیچے سے والد کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ساجد سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ وہ دوڑ کر نیچے آیا۔ والد کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ان کے سامنے شوکت سہما کھڑا تھا۔ جیسے کہ ایک بھیڑیا بھیڑ کے بچے کو کھانے کے لئے قسم قسم کے بہانے تراش رہا ہو۔ اور بھیڑ کا بچہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

ساجد اپنے والد کے غصے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا ماں کے پاس گیا۔ اور ماں کو سب کچھ کہہ سنایا۔

ماں نے آکر معجزانہ طور پر شوکت کو بچالیا۔

تین دن بعد ساجد نے دربان سے سنا کہ بستی کی آم والی کا لڑکا بخار میں پھنک رہا ہے۔ آم والا کئی بار آکر راجہ بابو کو ڈھونڈ کر چلا گیا۔ بخار میں اس کی زبان پر صرف "راجہ بابو، راجہ بابو" تھا۔

ساجد، اپنے سینے پر پہاڑ جیسا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کہ چند دنوں تک وہ نظر نہیں آیا تھا۔ شوکت کو بخار جو آگیا تھا۔

"میں شوکت کے یہاں کیسے جاؤں گا؟" ساجد نے ماں سے التجا کی۔

ماں بولی "باپ رے۔ اتنا سا بچہ اور بخار والے گھر میں جاؤگے!"

اجازت نہیں ملی۔ دل میں خوف کا بٹالین مارچ کر رہا تھا۔

ایک دن... دو دن... تین دن... چوتھے دن پڑوس کی بستی میں رونے پیٹنے کی آواز سن کر وہ گھبرا گیا۔ منجھلی بہن نے بتایا۔

"صبح بستی میں کسی کا لڑکا مر گیا ہے۔"

رجو نے ماں کو آہستہ سے بتایا۔ اور ماں کے منہ سے نکلا۔

"ہائے کسی ماں کا لخت جگر!"

غم سے ساجد کا سینہ پھٹ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ چیخ کر رو پڑا۔ ماں نے آواز دی "ساجد۔"

آنسوؤں کی جھڑی اور تیز ہوگئی۔ ساجد نے کہا "شوکت، میں آرہا ہوں۔" اور گیٹ کا دروازہ کھول کر بستی کی طرف بھاگنے لگا۔

ماں

سیفو چلتے چلتے، اچانک ٹھٹھک گیا۔ دیوار پر بلڈ بنک کی طرف سے چھپا ہوا اشتہار لگا ہوا تھا۔"
"خون کا عطیہ دینے والوں کو معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔"
یہ جملہ برق کی طرح اس کے دماغ سے ٹکرایا اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈاکٹر کا نسخہ اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ جو ماں کے لئے دوا خریدتا۔ وہ ماں جس نے نو مہینے اپنے پیٹ میں رکھکر جنم دیا۔ جس کے زیر سایہ پروان چڑھا تھا جس کے قدموں میں جنت ہے۔ آج وہی ماں بے چارگی، تنگدستی اور مجبوری کے عالم میں موت کے دروازے پر کھڑی تھی۔ مگر وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے جسم میں اسی ماں کا خون دوڑ رہا تھا۔ آخر یہ کس دن کیلئے کام آئے گا؟۔ اس کے قدم تیزی سے ہسپتال کی طرف بڑھنے لگے۔ جہاں بلڈ بینک تھا۔

سیفو کا اصل نام سیف الدین تھا۔ شہر کے مضافات میں اس کی اپنی ناریل کے پتوں اور بانس سے بنی ہوئی جھونپڑی تھی۔ موچی کا

پیشہ اسے خاندانی ورثے میں ملا تھا۔ اور وہ بوسیدہ جھونپڑی اس کی آبائی میراث تھی۔ جب وہ دس برس کا تھا۔ اس کا باپ دنیا سے چل بسا۔ ماں کے علاوہ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے وہ جوتے مرمت کرنے لگا۔ شروع میں ناکامی نے منہ چڑھایا مگر وہ ضبط سے ثابت قدم رہا۔ اکثر اس کے ننھے منے ہاتھوں سے جوتے خراب ہو جاتے تو لوگ اسے پیسے دینے کے بجائے تھپڑ رسید کرتے۔ وہ بیچارہ ننھا منا موچی بلک بلک کر روتا۔ مگر صبر و تحمل کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑتا۔ مصائب اسے چاروں طرف سے گھیرتے رہے لیکن وہ بحرِ غم کے بے رحم تھپیڑوں کا چٹان کی طرح مقابلہ کرتا رہا۔

اسی طرح دن گذرتے گئے۔ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچنے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں بھی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ بڑھاپے نے اس کی ماں کی جسمانی قوت چھین لی اور وہ بیمار رہنے لگی۔ وہ دل و جان سے اپنی ماں کی خدمت کیا کرتا۔ گھر کے ضروری اخراجات کے بعد جو پیسے بچتے اس سے ماں کیلئے دوا لاتا۔ مگر اسے بجائے افاقہ ہونے کے روز بروز اس کی صحت گرتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔

اور آج جبکہ اس کی ماں قریب المرگ تھی۔ سانس بھی اکھڑنے لگا ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آج رات بہت کٹھن ہے اگر صبح تک کسی طرح سلامت رہے تو زندگی کی نئی کرن ابھرے گی۔ ساتھ ہی نسخے میں دوائیوں کی ایک طویل

فہرست تھی۔ جس کے ساتھ اس کی ماں کی زندگی بھی منسلک تھی۔

اس رات زوروں کی گرمی پڑ رہی تھی۔ ہوا میں آگ کے شعلے دوڑتے پھر رہے تھے۔ اوپر آگ تھی۔ نیچے آگ تھی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ اور اس آگ میں انسان و حیوان جھلس جھلس کر بے دم ہو رہے تھے۔ اس گرمی میں سیفو اپنی ماں کے لئے دوا لیکر واپس آ رہا تھا۔ آج اس نے بلڈ بینک میں اس خون کی قیمت چکادی تھی جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

جیسے ہی اس نے اپنا قدم جھونپڑی میں رکھا۔ جلتا ہوا دیا۔ ہوا کے تیز جھونکے سے بجھ گیا۔ اور اس کی ماں کی روح قفس عنصری سے پرواز گئی "میں تمہارے لئے دوا لایا ہوں ماں" وہ اپنی ماں کے سرد جسم کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "ماں، تم بولتی کیوں نہیں ؟"

جب اس نے غور سے دیکھا تو قلب کی حرکت بند ہو چکی تھی۔

"ماں" ایک دلدوز چیخ کے ساتھ ماں کی لاش سے لپٹ گیا۔ جھونپڑی میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بجھے ہوئے دیئے کی لو سے نکلتی ہوئی دھوئیں کی لکیریں معدوم ہو رہی تھیں۔ اور ممتا کی روح بیٹے کے سر پر اپنی محبت کا آنچل پھیلائے کھڑی تھی۔

گرم سوٹ

شہر لاہور کی ہنگامہ خیز زندگی۔ جس میں ہلچل اور چہل پہل تھی۔ لمبی چوڑی سڑکوں پر ٹیکسی اور بسیں مغروروں کی طرح سر اٹھائے چلی جارہی تھیں۔ رکشا کی دوڑ ٹیکسی کے آگے ماند پڑی ہوئی تھی۔ فٹ پاتھ پر چہل پہل ایک ہلچل برپا کئے ہوئے تھی۔ مال روڈ میں جگمگاتے ہوئے بلب اور رنگین بتیاں اسی طرح چمک رہی تھیں نیلے آسمان پر تاروں کا جمگھٹ کہکشاں بن کر جھلملاتا ہو۔

۔ اسے دیکھ کر کسی دیوالی کی رات کا تصور دماغ میں آجاتا۔ فٹ پاتھ کے کنارے بڑی بڑی عمارتیں کھڑی تھیں۔ جن کی نچلی منزل پر دکانیں تھیں۔ شوکیس میں لگی ہوئی مختلف اشیا لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ جاڑے کی خوشگوار رات میں خنکی نے اپنا تسلط جمالیا تھا۔

جاوید پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے ایک دکان کے شوکیس کے پاس کھڑا تھا۔ سردی سے دانت بج رہے تھے۔ اس کی نگاہیں شوکیس کے اندر رکھے ہوئے گرم سوٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ جس کے ساتھ چپکی ہوئی سلیپ میں اس کی قیمت دو سو روپے لکھی ہوئی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ سوٹ اس کی غربت کا مذاق اڑا

رہا ہے۔ کاش اس کے پاس ۱۷۵ روپے ہوتے اور وہ یہ سوٹ خرید سکتا۔ وہ کتنا بیوقوف ہے۔ بھلا اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے جبکہ وہ بے کار تھا۔ اور جب اتنے روپے نہیں تو وہ سوٹ کا خواب کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس وقت اسکی جیب میں صرف چار آنے تھے۔ اور وہ قیمتی لباس کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ان چار آنوں میں تو اسکے کفن کا ایک ٹکڑا بھی نہ مل سکتا تھا۔

فیس نہ دینے کی وجہ سے اسے کالج سے نکال دیا گیا۔ پہلے اس نے روپے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب ناکامی ہوئی تو اس نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ پر اسے کہیں بھی کوئی نوکری نہ ملی۔ ہر آفس کے دروازے پر "NO - VACANCY" کا بورڈ اس کا منہ چڑاتا۔ اسے کتنی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس نے کتنی ہی جگہ نوکری کے لئے درخواستیں بھیجیں اور اسے بعض جگہ انٹرویو کے لئے بلایا بھی گیا لیکن نتیجہ ہمیشہ ہی صفر رہا۔

ملک میں ہر طرف بیکاری پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی طرح نہ معلوم کتنے ہی نوجوان نوکری کے چکر میں ٹھوکریں کھا رہے تھے اور کتنے ہی لوگ اس افلاس اور بھوک سے تنگ آکر خودکشی کر چکے تھے۔

وہ وہاں سے آگے بڑھا تو تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چنے والے کو دیکھا بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔ پیٹ میں اناج کی جگہ ایک بہت بڑا دکھتا ہوا گولا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے چنے والے سے چار آنے کا چنا خریدا اور اسے ہی چبا کر بھوک مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چنا چباتا ہوا اپنے

خیالوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ اچانک وہ چونک پڑا۔ کیونکہ اس کا چنا ختم ہو چکا تھا۔ اور ہاتھ میں صرف اخبار کا ٹکڑا بچ گیا تھا۔ وہ حیرت سے اخبار کے ٹکڑے کو گھورنے لگا۔ اس میں اسے کسی ٹیکسی کمپنی کا اشتہار نظر آیا۔ ایک کمپنی کو ٹیکسی ڈرائیوروں کی ضرورت تھی۔ جو روزانہ شہر میں سواری کیلئے ٹیکسی کرایہ پر لے جایا کرے۔

آخر جاوید نوکری سے ناامید ہو کر ٹیکسی ڈرائیور بن گیا۔ ٹیکسی کمپنی کی طرف سے ٹیکسی اسکے تحویل میں دیدی گئی۔ اس کمپنی میں اس کی طرح نہ معلوم کتنے لوگوں کی زندگی ٹیکسی کے پہیوں کی طرح گھوم رہی تھی۔

انسان کی زندگی میں اکثر بھول بھلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور بعض حادثات ایسے پیش آتے ہیں کہ انسان عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے چنانچہ ایک روز دن ڈھلنے کے بعد جاوید نے اپنی ٹیکسی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور اندر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں آواز آئی۔ "ڈرائیور، جانا ہے؟"

وہ چونک کر گھوم پڑا۔ ایک سوٹیڈ بوٹیڈ ادھیڑ عمر شخص اس سے پوچھ رہا تھا۔ اسکے بغل میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ جس کا حسن چودھویں کے چاند کو بھی شرما رہا تھا۔ قدرت نے اسے ایسا دلکش اور پرنور چہرہ عطا کیا تھا کہ دیکھنے والا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ بیضوی چہرہ، غزالی آنکھیں نہایت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے گیسوئے دراز کی گندھی ہوئی لٹیں اسکے

گداز سینے پر دونوں طرف اس طرح پڑی تھیں۔ جیسے دو سیاہ سانپ جھول رہے ہوں۔ اس نے سلک کی گلابی ساڑی پہن رکھی تھی اور بلاوز بھی گلابی تھا۔ سینے کے مدوجزر پر ساڑی کا آنچل تھا جو کہ اس کے زیروبم کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس کا حسن دیکھکر وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا اور اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ جس میں شرم وحیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کی شرم سے بوجھل پلکیں اٹھیں اور نگاہیں چار ہوتے ہی حیا سے جھک گئیں۔ اور اسکے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جب اس کی پیار بھری نظریں اٹھیں تو اس کی زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ یہ مدبھری آنکھیں اسکی جانی پہچانی تھیں۔ کبھی اس نے ان آنکھوں میں ڈوب کر اپنی زندگی پانے کی کوشش کی تھی۔ کالج کی زندگی میں ان ہی آنکھوں نے اس کے دل میں محبت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ مگر جلد ہی وہ ناگن بنکر اسے ڈسنے لگی۔ اور جب اسے اس سے زیادہ شکیل جاذب نظر ملا۔ اور مالدار لڑکا مل گیا تو اس کی باہنوں سے مچل کر اس کی باہنوں میں چلی گئی تھی۔ اس طرح اس کا دل محبت کا پہلا وار کھا کر تڑپ اٹھا تھا۔

غالبًا وہ اسے پہچان گئی تھی۔ وہ آدمی آرام سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"آؤ مہ نور، بیٹھو۔" اس نے اس حسن کی دیوی کو آواز دی۔

"کہاں چلوں؟"

"گلبرگ۔" ادھیڑ عمر شخص نے یہ کہہ کر پچھلی نشست کی پشت

سے ٹیک لگادی۔ اس کے بغل میں مہ نور بیٹھی تھی۔ جس کی صورت میں دیویوں جیسی معصومیت اور حوروں جیسی خوبصورتی تھی۔ مگر جس کی فطرت ناگن جیسی تھی۔ جسے ایک بار ڈس لیتی وہ ساری زندگی انگاروں پر لوٹتا رہ جاتا۔

اس کی ٹیکسی سڑکوں پر کسی دوشیزہ کی طرح سر اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ ہوٹلوں اور دکانوں کے اوپر بجلی کی روشنی کے سائن بورڈ نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ سرخ، سبز نیلے، پیلے بلبوں سے ہر طرف قوس و قزح جیسے رنگ جھلملا رہے تھے۔ سینما کے اوپر بجلی کی رنگین روشنی صرف ایک سیکنڈ کیلئے جلتی اور پھر بجھ جاتی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہجوم کے قہقہے اور لوگوں کی گفتگو سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گلشن میں چڑیوں نے ہلچل مچادی ہو۔ موٹروں کے ہارن اور رکشا کے پہیوں کی آوازیں ہر سکنڈ پر کان سے ٹکراتی۔

جب تک وہ ٹیکسی چلاتا رہا۔ سامنے کے آئینے میں مہ نور کی صورت دیکھتا رہا۔ وہ بھی کبھی کبھی نظریں چرا کر اسے دیکھ لیتی۔

ٹیکسی ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گئی۔ پہلے وہ شخص اترا۔ پھر اس کے پیچھے مہ نور اتری۔ مہ نور کرایہ ادا کرنے کے لئے وینٹی بیگ کھولنے لگی۔ جب تک وہ شخص اندر جا چکا تھا۔

"جاوید! یہ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟" مہ نور نے اس سے پوچھا۔

"گردش زمانہ نے مجھے تمہارے سامنے ڈرائیور کی شکل میں لا کھڑا کیا

ہے۔ تمہارا ان دنوں کیا چکر ہے؟ یہ عمارت کس کی ہے اور یہ صاحب جو اندر گئے ہیں، کون ہیں؟"

"یہ میرے شوہر ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے شادی ہوئی ہے۔" اس نے ایک ادائے دلبری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ بالوں کی ایک شوخ لٹ اس کی پیشانی کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہارے اس شوہر کا نمبر کیا ہے؟" جاوید نے طنز کیا۔

"ابتک تمہاری جلی کٹی سنانے کی عادت نہیں گئی۔ یہ لو کارڈ میری شادی کی تقریب ہے، ضرور آنا۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

پہلے اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر ایک کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما کر اٹھلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ جاوید بھولی ہوئی داستان کی ایک انہونی لذت اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔

جاوید نے سوچا کہ کسی نہ کسی صورت اس تقریب میں شرکت ضروری ہے۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ مہ نور نے نئے شکار کو اپنی زلفوں کے جال میں کیسے اسیر کیا اور نہ معلوم اسکے تیر نظر سے ابتک کتنے گھائل ہوئے تھے۔ مگر یہ مہ نور جس سوسائٹی کی پروردہ تھی وہ ملک کے متمول اور نئی تہذیب کے علمبرداروں میں شمار کی جاتی تھی۔ کم از کم جاوید جیسے آدمی کا گذر شاید ہی وہاں ہوتا تھا۔ وہ اس دنیا کیلئے بالکل نئی مخلوق تھا۔ جبکہ مہ نور نے اسے مدعو کیا تھا۔ تو بھلا وہ کیسے ٹال سکتا تھا۔ وہ اپنی پھٹیچر حالت کی طرف

دیکھتا اور دل مسوس کر رہ جاتا۔ اسکے پاس ڈھنگ کا کوئی کپڑا نہ تھا۔ تقریب میں سب کے سب زرق برق لباس میں آئیں گے۔ ان کپڑوں میں وہ اپنے آپ کو حقیر محسوس کرے گا۔ شرکت کرنی ہے تو ایسے لباس میں کرے کہ کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ منور کا کلاس فیلو گنوار اور پھٹیچر ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ کہیں منور نے اسے جلانے کے لئے مدعو نہ کیا ہو۔ یا اپنی امارت کی دھاک بٹھانے کے لئے بلایا ہو۔ مگر اس معصوم اور بھولی صورت کا خیال آتے ہی وہ اپنے ذہن سے ان باتوں کو جھٹک دیتا۔ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ڈھنگ کا کوئی کپڑا خریدتا۔ سردی کا موسم تھا۔ ہر کوئی گرم سوٹ اور سوئٹر میں نظر آتا مگر وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے میں ٹھٹھرتا ہوا زندگی گذار رہا تھا۔

اچانک اسے امید کی کرن نظر آئی۔ نکڑ والی گلی میں ایک صحافی احمد رہتا تھا۔ کسی زمانے میں دونوں نے اسکول میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ میٹرک کے بعد وہ صحافت سے منسلک ہوگیا۔ جب اس کی نائٹ شفٹ ہوتی تو اخبار کے دفتر سے رات کے دو تین بجے گھر آنے میں اسے بڑی دقت ہوتی۔ اتنی رات گئے کوئی سواری بھی نہیں ملتی تھی۔ البتہ جب کبھی جاوید رات کو گھر واپس آتا تو اسکے دفتر سے ہوتا ہوا آتا تھا۔ اتنی رات کو وہ صحافی کے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوتا تھا۔

احمد کو اکثر بڑے بڑے فنکشنوں میں شرکت کرنی پڑتی تھی۔ اسلئے اس نے سلیقہ کا لباس سلوار کھا تھا۔ رکھ رکھاؤ اور ظاہر داری آدمی آجکل معاشرے میں پنپ جاتا ہے۔ مفلوک الحال کو کوئی پوچھتا تک نہیں جاوید اس سے پہلے

بھی محلے کی ایک شادی کی تقریب میں شرکت کیلئے احمد سے قمیض پتلون ادھار لے چکا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ جب وہ اپنی مجبوری اسکے سامنے بیان کرے گا تو صحافی دوست اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔ آخر کار وہی ہوا جیسا کہ اس نے سوچا تھا۔ منہ کھولتے ہی احمد نے اپنا گرم سوٹ نکال کر اسے دیدیا۔ آج کل کی دنیا میں ایسا بہت ہم کم ہوتا ہے کہ کوئی اپنی ضرورت کی چیزیں دوسرے کو دیدے اتفاق سے احمد اور جاوید دونوں کا ڈیل ڈول ایک جیسا تھا۔ اس لئے سوٹ جاوید کو بالکل فٹ ہوگیا۔ کمر کچھ ڈھیلی تھی اس لئے اس نے کس کر بیلٹ باندھ لیا۔

سورج غروب ہوچکا تھا نیلگوں آسمان پر شفق کی سرخی اس طرح بکھری ہوئی تھی جیسے کسی حسینہ نے اپنے رخسار پر غازہ مل رکھا ہو۔ پوری عمارت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ہر طرف نیلے، پیلے، سرخ و سفید بلب جھلملا رہے تھے۔ دروازے پر مہ نور اور اسکے شوہر استقبال کے لئے موجود تھے۔ جاوید کو دیکھتے دونوں مسکرائے۔

"آیئے آیئے! آپ ہی کا انتظار تھا۔" اس کے شوہر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے میرے علاوہ دوسروں کی موجودگی غیر ضروری ہے۔" جاوید نے چوٹ کی۔

مجھے مہ نور نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ اس کے کلاس فیلو ہیں نا؟"

وہ اس کی حاضر جوابی سے بوکھلا گیا۔

عین اسی وقت مہمانوں کا ایک جوڑا آگیا اور وہ انکی طرف مخاطب ہو گئے۔

مہ نور اس روز نیلی ساڑی میں بے حد جچ رہی تھی جب وہ مسکراتی اور اپنے حسن کی بجلی گراتی ہوئی اس سے مخاطب ہوئی تو فضا میں موسیقی بکھر گئی وہ اسے ایک صوفے پر بٹھا کر دوسرے مہمانوں کے استقبال کو چلی گئی۔ ہال میں کافی لوگ آچکے تھے۔ ریڈیو گرام سے نکلتی ہوئی سازینہ کی لے فضا کو سحر زدہ کئے ہوئے تھی۔ سینٹ اور پرفیوم کی خوشبو سے سارا ہال معطر تھا۔ ہر طرف گداز اور سیمیں جسم کی خوبصورتی بکھری ہوئی تھی۔ اور اس خوبصورتی کے آغوش میں حسین دوشیزائیں بھڑکیلے لباس پہنے آجا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہال میں پریوں کا راج ہو گیا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس ملازم کبھی اس میز پر کبھی اس میز پر سرو (serve) کرتے پھر رہے تھے۔ سمپئین، بیئر اور بلیک اینڈ وائٹ کے کارک فضا میں اڑ رہے تھے۔ مرد تو مرد، عورتیں بھی مشروب سے جی بہلا رہی تھیں۔ یہ تھیں نئے ماحول کی پیداوار۔ اِس کی بیوی اُسکے پہلو میں اور اُسکی بیوی اسکے بغل میں۔ کھنکتے قہقہوں کے ساتھ موٹے اور بھولے سیٹھوں سیٹھوں کی کھوکھلی ہنسی سے جاوید کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ عین اس وقت ایک خوش پوش ملازم اسکے قریب آیا۔

"آپ کے لئے کیا لاؤں صاحب؟"

"صرف ایک کپ کافی۔"

بیرا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا چلا گیا۔

جاوید کافی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نئی تہذیب کے دلدادہ جب کسی کاک ٹیل پارٹی یا کلب میں شرکت کرتے ہیں تو فیشن میں شمار کیا جاتا ہے اور اسے سوسائٹی موو (MOVE) کرنے کا بہترین ذریعہ بتاتے ہیں۔ مگر جب غریب اپنے غم کا مداوا تلاش کرتے ہیں تو گنوار اور "ان کلچرڈ" کہلاتے ہیں۔ جب کسی فنکشن میں رقاصائیں ناچتی ہیں تو فن اور آرٹ کے نام سے سراہا جاتا ہے۔ اور جب وہی رقاصائیں کوٹھے پر رقص کرتی ہیں تو انہیں طوائف رنڈی اور بیسوا کا خطاب دیا جاتا ہے اور انہیں معاشرے کے ماتھے پر ایک بدنما داغ سمجھا جاتا ہے۔" یہ آجکل کی نئی روشنی کا المیہ ہے۔ جس کے ظاہر و باطن میں یہ فرق ہے۔ جاوید کو اس سوسائٹی سے، اس کے ماحول سے گھن سی آنے لگی۔ وہ بغیر منور سے ملے آہستہ سے باہر نکل آیا۔ باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈک سے دانت بج رہے تھے۔ کھلی فضا میں آنے سے اسے اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس ہوا۔ کافی دور پیدل چلتا رہا۔ فٹ پاتھ کے کنارے اس کی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ایک بج رہا تھا۔ سردی پورے شباب پر تھی۔ اس نے سب سے پہلے سوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ پھر انگیٹھی جلادی۔ نیند سے اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ وہ جماہی لیتا ہوا بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند کی پریاں اسے اپنے اڑن کھٹولے میں بٹھا کر پرستان کی رنگین فضاؤں میں لے گئیں۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ۔ کمرے میں اندھیرا تھا ۔ کپڑے جلنے کی بو اس کے نتھنے سے ٹکرائی ۔ جب اس نے روشنی کی تو دل دھک سے رہ گیا ۔ گرم سوٹ ہوا کے جھونکے سے لہرا کر انگیٹھی پر گر پڑا تھا ۔ اور اب دھڑا دھڑ جل رہا تھا ۔ اس نے جلدی جلدی آگ بجھائی ۔ روشنی کے قریب لا کر دیکھا تو سوٹ کا ایک تہائی حصہ جل کر بیکار ہو چکا تھا ۔ اب وہ پہننے کے قابل بھی نہ تھا ۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا ۔ اب کیا کرے ؟ دوست سے سوٹ مستعار لایا تھا ۔ اب اسے کیا منہ دکھائے گا ؟ اگر سوٹ واپس نہیں کرتا ہے تو وعدہ خلافی ہوتی ہے اور اگر جلا ہوا سوٹ دکھاتا ہے ۔ تو غیر ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے دونوں صورت میں وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہا ۔

اس ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی ۔ اس نے اپنی ٹیکسی نکالی اور سواری کی تلاش میں نکل گیا ۔ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے دوست کا سوٹ لوٹانا تھا ۔ اور اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ اسے اس کا نعم البدل دیا جائے ۔ اس کے لئے اسے دن رات ایک کر کے پیسے جمع کرنے کی ضرورت تھی تاکہ جلد از جلد نیا سوٹ اپنے دوست کے حوالے کرے !

وہ روزانہ بہت سویرے ٹیکسی لے کر نکلتا اور کافی رات گئے گھر میں داخل ہوتا ۔ اس نے آرام اپنے اوپر حرام کر لیا تھا ۔ کولہو کے بیل کی طرح لگا ہوا تھا ۔ وہ حتی الامکان احمد سے ملنے سے کتراتا ۔ وہ جس گلی کے نکڑ پر رہتا تھا ادھر سے گذرنا بھی چھوڑ دیا تھا ۔ مبادہ کہ اس سے مڈبھیڑ ہو جائے اور

جاوید کو شرمندگی اٹھانا پڑے۔ وہ ایک ماہ تک مسلسل ٹیکسی چلاتا رہا، پیسے جمع کرتا رہا۔ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر خون پسینے ایک کر کے آخر کار دو سو روپے جمع کر لئے اور مال روڈ کے دکان سے سوٹ خریدا۔ جہاں کر کسی زمانے میں وہ شو کیس میں سوٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔

اس نے اپنی ٹیکسی احمد کے مکان کے سامنے روکی۔ آج اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کا دوست میز پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔

"ارے تم کیسے؟ بڑے دنوں کے بعد آئے" وہ اسے دیکھتے ہی پوچھ بیٹھا "اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"بس ذرا مصروف رہا" جاوید نے سوٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو سوٹ حاضر ہے"

"مگر پیکٹ میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا دھلوا کر لائے ہو؟" بیچارہ حقیقت سے بے خبر تھا۔ اس نے آہستہ سے پیکٹ کھولا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"مگر یہ میرا سوٹ نہیں ہے" اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"ہاں! تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ دراصل ...." اس کو جاوید نے تمام باتیں تفصیل سے بتا دیں۔

"مگر اس کی کیا ضرورت تھی ؟"

بہر حال جب تمہارا سوٹ ضائع ہوگیا تو مجھے اس کی تلافی اسی میں نظر آئی ۔

"مگر ......" اس نے کہنا چاہا ۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں کہ تم صرف میری وجہ سے پریشانی ہوئی ۔" جاوید نے بات کاٹ کر کہا "اور تمہیں اپنے سوٹ کے اتنے دنوں تک انتظار کرنا پڑا ۔"

مگر میری پوری بات تو سن لو ۔ سوٹ تو پرانا تھا ۔ لنڈے بازار سے پچیس روپے میں خریدا تھا ۔ تم ناحق اسکے لئے اتنے پریشان رہے ۔ بھلا اسکے لئے نیا سوٹ لانے کی کیا ضرورت تھی ؟"

"کیا کہا تم نے ۔" جاوید کو اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا ۔ سردی کے موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ پڑے ۔

منزل

جاڑے کی وہ رات بے حد اداس اور بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ فلک پر بادل آوارہ روحوں کی طرح بھٹک رہے تھے۔ کہیں کہیں ٹمٹماتا ہوا کوئی تارہ کسی غم نصیب کے دل میں چراغ حسرت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شمال کی طرف سے کالی گھٹائیں اپنی بازوؤں کو پھیلائے اسی طرح بڑھ رہی تھیں جیسے پوری کائنات کو اپنی تاریکی میں سمیٹ لیں گی۔ اور کبھی کبھی بجلی چمکتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ مقبروں میں موت کی اَبدی نیند سونے والی روحیں تلوار کھینچے مقبرے کی فصیل پر گشت کر رہی ہیں۔ سردی شباب کی انتہائی منازل طے کر رہی تھی۔

تمام لوگ دبی دبی سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ قبرستان کے بیرونی دروازے کے پاس ہی اینٹوں سے بنے ہوئے کمرے میں جنازہ رکھا ہوا تھا اور وہاں سے کچھ فاصلے پر املی کے درخت کے نیچے گورکن جلدی جلدی کدال چلا رہا تھا۔ اس ٹھنڈک میں بھی اس کے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا ہاتھ روک لیتا اور فضا کی طرف منہ کر کے گہری ٹھنڈی سانس لیتا اور تندہی سے کدال چلانے لگتا۔ وہاں سے شہر صاف

نظر آرہا تھا۔ سڑکوں پر چمکتے ہوئے دودریہ بلب اس طرح چمک رہے تھے۔ جیسے لاتعداد شیطانی آنکھیں اپنی پوری ہیبت ناکی سے تک رہی ہوں۔ اور کمبٹ کے بلند قامت درختوں کے سائے قوی ہیکل پاسبانوں کی طرح اپنے بازو پھیلائے جھوم رہے تھے۔ بھٹکتی ہوئی بوجھل ہوائیں جھاڑیوں میں چیخ رہی تھیں۔ جب کسی درخت پر اُلو کی کربناک آواز سنائی دیتی تھی تو جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ وہاں بیٹھے ہوئے سب ہی یہی سوچ رہے تھے کہ اس شہر خموشاں میں انہیں بھی ایک دن آنا ہوگا۔ ہزاروں قبروں کے کے ساتھ ان کی قبر کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اور کچھ دن بعد ان کی قبر پر گھاس اُگ آئے گی اور وہاں سے گذرنے والی ہواؤں سے اپنی گردن ہلا ہلا کر کہے گی کہ ابھی اور نہ جانے کتنے یہاں آئیں گے۔ اور اپنے آخری اور ابدی قیام گاہ کی طرف آسمان کے درخشاں ستاروں کو ٹوٹ کر گرتے ہوئے دیکھیں گے۔

شام کو کتنی ہی آنکھوں میں غم کے آنسو ستارے بنکر چمکے تھے۔ دل کے شعلے آنکھوں سے نکل فضاؤں میں تحلیل ہو گئے تھے۔ مرنے والی کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ ایک نوخیز کلی! جو پھول نہ بن سکی۔ جیسے باد سموم کے گرم جھونکوں نے جھلسا کر رکھدیا۔ مرنے والی کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ وہ ننھی سی جان جسے موت کے ظالم ہاتھوں نے اپنے شکنجوں میں جکڑ لیا۔ وہ پورے گھر کی خوشیوں کا مرکز تھی۔ وہ سب کی آنکھوں کا تارہ تھی۔ اسکی مسکراتی آنکھیں جیسے ہزاروں شوخ قندیلیں جگمگا رہی ہوں۔ اس کا

معصوم چہرہ دیکھ کر کلیاں چٹک جائیں۔ ماتھے پر کندن کی دمک اور کلکاریوں میں ساغر کی سی کھنک تھی۔ جس کی مسکراہٹ سے سارے گھر میں بہار آجاتی۔

مگر اچانک شام کو قضا نے اسے آدبوچا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کی موت پر آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ سبھوں کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل پڑے۔ خوشیوں کی راگنی کروٹ بدل کر سو گئی اور ایک نوخیز کلی شاخ سے ٹوٹ کر زمین بوس ہو گئی۔

کلمۂ شہادت کی بھنبھناہٹ کے درمیان اس کی لاش قبر میں اتاری گئی۔ قبر کے چاروں طرف سے اداس نظریں مرنے والی کا آخری دیدار کر رہی تھیں۔ اپنے آخری قیام میں بھی اس کے لبوں پر فرشتوں جیسی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ موت کی ابدی نیند سو رہی تھی۔ مگر اسکی بند زبان زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

زندگی بلبلہ ہے پانی کا

انسان آج ہنس رہا ہے۔ مسکرا رہا ہے۔ پتہ نہیں کب موت آجائے۔ اور اس کی زندگی بلبلے کی طرح ٹوٹ جائے۔ جسم سے روح نکل جائے۔ اور بے جان جسم خاک میں مل کر خاک ہو جائے گا۔ پھر دوسری قبروں کے ساتھ ایک اور قبر کا اضافہ ہو جائے گا۔ پہلے کی طرح پھر دنیا کا کاروبار چلنے لگے گا۔ لوگ قہقہے لگائیں گے۔ شہر میں پہلے کی چہل پہل ہو گی۔ سینما ہاؤسوں میں ہمیشہ کی طرح بھیڑ ہو گی۔ ہوٹل، کافی ہاؤس بالاخانے پہلے کی طرح آباد

آباد ہو گئے ۔ اور قبر میں سوئے ہوئے مردے کا وجود آہستہ آہستہ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ کوئی بھی یہ نہ سوچے گا کہ ہم یہاں عیش کر رہے ہیں اور مرنے والا کئی من مٹی کے نیچے سسک رہا ہو گا۔ دنیا کی تو یہی ریت ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے ۔

زمانے کی گردش کچھ ہی عرصے میں اس قبر کو برابر کر دے گی اور سوچنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کرے گا کہ یہاں بھی کسی قبر ہے یا کوئی یہاں ابدی نیند سو رہا ہے۔ پھر اس کے اوپر دوسری قبر بن جائے گی۔ اور اسی طرح سلسلہ جاری رہے گا۔

...... لوگ مٹھیوں میں مٹی لے لے کر قبر پر ڈال رہے تھے۔

وہ معصوم جو قبر میں میٹھی نیند سو رہی تھی۔ اگر زندہ رہتی تو ایک دن درخشاں ستارہ بن کر چمکتی۔ مگر افسوس! ایک کلی تھی جو مرجھا گئی۔ ایک ستارہ تھا جو ٹوٹ گیا! ــ

لوفر

نصرت کسی یونانی شہزادے کی طرح خوبصورت تھا۔ عمر بائیس تیئس کے قریب ہو گی۔ اسے تنہائی سے محبت تھی۔ ہمیشہ اکیلا بیٹھا کسی گہرے خیال میں کھویا رہتا۔ نگاہیں دور نیلگوں فلک پر مرکوز رہتیں اور خیالات آوارہ بادلوں کی طرح بھٹکا کرتے۔ فرصت کے اوقات میں کالج کے لڑکے لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف ہوتے تو نصرت دور کسی کونے میں سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتا ہوا کسی گہری سوچ میں غرق رہتا اور اس وقت چونکتا جب سگریٹ جلتے جلتے اس کی انگلیوں کو جلانے لگتا۔ وہ لڑکیوں سے دور بھاگتا۔ اسے ان کھوکھلی ہنسی سے نفرت تھی۔ دنیا میں اگر کسی چیز سے محبت تھی تو وہ اس کی کتابیں۔

شبانہ، نصرت کی ہم جماعت تھی۔ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ سیب کی طرح سرخ گال، سڈول جسم اور غزالی آنکھیں جن میں جادو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سر سے پیر تک سراپا حسن تھی۔ جیسے کسی فنکار کی عظیم شاہکار ہو۔ گھر سے کالی عینک لگائے جب وہ کالج کیلئے نکلتی تو سینکڑوں مشتاق آنکھیں اس کی طرف لگی ہوتیں۔ جس پر اس کی نگاہیں اٹھ جائیں

وہ خوشی سے دیوانہ ہو جاتا۔ اور جس سے وہ ہنس کر دو ایک بات کر لیتی۔ اس کو تو جیسے خزانہ مل جاتا۔ راستے میں اجنبی نوجوان اسے دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ سارے کالج میں اس کی خوبصورتی کا چرچا تھا۔ اس کی کلاس میں سبھی طرح کے لڑکے پڑھتے تھے۔ ایک سے ایک امیر ایک سے ایک خوبصورت۔ لیکن شبانہ ان پر نگاہ تک نہ ڈالتی۔ اس کی محبت اور آرزو نصرت اور صرف نصرت ہی تھا۔ وہ اسے بے حد چاہتی تھی۔ اس کی معصومیت سے اسے پیار ہو گیا تھا۔ مگر وہ اب بھی اس کے خیالوں سے بہت دور تھی۔

شبانہ ہر وہ کام کر ڈالتی۔ جس کے بارے میں اسے گمان ہوتا کہ اس کا محبوب اسے ضرور پسند کرے گا۔ مگر لاحاصل۔ مختلف رنگوں کی ساریاں پہنتی۔ بیسوں طرح سے بال سنوارتی۔ مگر سب بےکار۔

ان دنوں کالج میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ شبانہ نے کبھی ایسے پروگراموں میں حصہ نہ لیا تھا۔ مگر اس بار اس نے جلسے میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ جلسہ ہونے میں چار دن باقی تھے وہ چار دن شبانہ نے اپنی تقریر درست کرنے میں گذار دیئے۔ تقریر کا آغاز اور انجام اتنے حسین خیالوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ اس میں اس قدر لوچ تھا۔ اتنی دلکشی تھی کہ بعض اوقات اسے اس صداقت پر شبہ ہونے لگتا کہ یہ اس کی اپنی لکھی ہوئی تقریر ہے۔

جلسے کا دن آن پہنچا۔ شبانہ دل ہی دل میں ڈرتی ہوئی جلسہ گاہ

میں داخل ہوئی۔ پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شبانہ کو دیکھتے ہی سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ پنڈال کی فضا تالیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ شبانہ نے آکر ایک نگاہ سامعین پر ڈالی۔ نصرت بھی وہاں موجود تھا۔ شبانہ کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی اس نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اسے پنڈال کے سارے لوگ مجسموں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ان میں اگر کوئی ذی روح تھا تو وہ نصرت تھا۔ شبانہ کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ اس سے وہ تقریر کی داد مانگ رہی تھی۔ لیکن نصرت تو اس طرح بیٹھا تھا۔ جیسے کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔ تقریر کے دوران مختلف موقعوں پر سامعین گرم جوشی سے تالیاں بجانے لگتے اور دیر تک بجاتے۔ لیکن نصرت کے ہاتھ ایک بار بھی متحرک نہ ہوئے۔ اس کی آنکھیں صرف مقرر کی جانب اٹھ جاتیں۔ تقریر ختم کر کے جب شبانہ اپنی جگہ واپس آئی تو دو منٹ تک تالیوں کی آواز سے فضا گونجتی رہی۔ ایسی تقریر آج پہلی بار سنی گئی تھی۔ اس کی کلاس کے تقریباً سبھی لڑکے اس کے حضور میں مبارکباد پیش کرنے آئے۔ مگر شبانہ کی آنکھیں تو صرف نصرت کی متلاشی تھیں۔ کان اس کے منہ سے تعریف کے چند الفاظ سننے کے منتظر تھے۔ لیکن نصرت نہیں آیا۔ شبانہ جز بز ہو کر رہ گئی۔ نہ جانے وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ چند روز کے بعد شبانہ کے والد برسوں کی سعی پیہم کے بعد میونسپلٹی کے ممبر بننے میں کامیاب ہو گئے اس خوشی میں پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ کالج میں شبانہ نے سب سے پہلے

نصرت کو دعوت دی۔ اور اصرار کیا تو اس نے بڑی بے رخی سے کہا۔
"وعدہ تو نہیں کرتا۔ لیکن دیکھئے کوشش کروں گا۔"
مگر نصرت کو نہ جانا تھا۔ وہ نہ گیا۔ اگلے دن جب کالج گیا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس سے کوئی پوچھ رہا ہو۔ آپ کل آئے کیوں نہیں؟۔
نصرت نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو شبانہ اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ "آپ نے مجھ سے کہا۔" نصرت نے گڑبڑا کر سوال کیا۔
"جی ہاں آپ ہی سے۔" شبانہ نے جواب دیا۔ نصرت کے پیر لڑکھڑانے لگے۔ کسی لڑکی کے ساتھ کھلی جگہ میں گفتگو کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ نہ جانے کوئی کیا سوچے، کیا سمجھے۔ ہمت کر کے بولا۔ دیکھئے باغ میں آجائیے اور جو کچھ کہنا ہو وہیں کہیئے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باغ میں گھس گیا۔ شبانہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ باغ میں ان دونوں کے سوا تیسرا کوئی نہ تھا۔
"آپ کل آئے کیوں نہیں؟" شبانہ نے وہی سوال پھر دہرایا۔
جی کیا کروں، وقت ہی نہیں ملا۔ گھر پر کام بھی تو بہت رہتا ہے۔" نصرت نے جواب دیا۔
"یہ تو آپ کی بہانہ بازی ہے۔ اصل وجہ تو کچھ اور ہے۔ آپ جیسا سمجھیں۔ میں نے کل آپ کا کتنا انتظار کیا۔ آپ کے نہ آنے سے مجھے کتنا دکھ ہوا۔ ... آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" یہ کہہ کر شبانہ نے نصرت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نصرت، شبانہ کی اس غیر متوقع حرکت پر سر تا پا کانپ گیا۔ برق کی سی تیزی سے وہ شبانہ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتا تھا کہ نہ معلوم کدھر سے باغ میں بخاری داخل ہوا۔ بخاری، کالج کی بلیک یونین کا سربراہ تھا۔ شبانہ کے گھر اس کا آنا جانا تھا۔ شبانہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اب ۔ اب کیا ہوگا؟ اگر اس وقت نصرت نے اپنے منہ سے میرے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو میں کہیں بھی منھ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ سارے کالج میں میرا نام بدنام ہو جائے گا۔ اس سے قبل مجھے کوئی راستہ نکال لینا چاہیئے۔ شبانہ نے فوراً ہی طے کر لیا۔ اس کی گردن تن گئی۔ پیشانی پر بل پڑ گئے، چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بڑی ترش روئی سے بولی "لوفر"

"کیا ۔ ؟" نصرت ہکا بکا رہ گیا۔

"کسی شریف لڑکی کو چھیڑتے ہوئے شرم نہیں آتی" نصرت کو بے حد قلق ہوا۔ اُف اتنا جھوٹا الزام، شبانہ نے مجھ سے کب کا بدلہ لیا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے لوہے کی سیخ گرم کے اس کے دل میں چبھو دی ہو۔ وہ کچھ نہ بول سکا۔ نہ سوچ سکا۔ شبانہ کے الفاظ ناگن کے زہر سے بھی زیادہ زہریلے تھے۔ یہ واقعہ آن کی آن میں کالج کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ لڑکے اور لڑکیوں کی بھیڑ کی بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ کیچڑ اچھالا جانے لگا۔

"دیکھنے میں بڑا معصوم نظر آتا ہے بیچارا۔ لیکن......" ایک نے کہا۔ ارے لیکن ویکن کیا۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور

دوسری آواز ابھری۔

غرض کہ اسی طرح کے ریمارکس پاس ہوتے رہے اور نصرت کے کلیجے میں سوئیاں بن کے چبھتے رہے۔ اس نے بھیگی پلکوں سے شبانہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر غم و غصہ کا رنگ بدستور قائم تھا۔ کسی نے پرنسپل صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی۔ لہٰذا انہوں نے نصرت کو فوراً اپنے آفس میں طلب کیا۔

جاؤ بچو! اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ آنکھیں لڑانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے"۔ ایک آواز اور گئی قہقہے گونجے۔ پرنسپل کے بلاوے پر وہ جیسے کانپ اٹھا۔ اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ اس کا ذہن کئی وسوسوں کی آماجگاہ بن گیا۔ کالج سے اسٹیکیٹ کر دیا جاؤں گا تو دوسرے کالج میں داخلہ نہیں ملے گا۔ پھر ڈگری کیسے لوں گا اور ڈگری نہیں ملی تو نوکری کیسے ملے گی۔ منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے مستقبل کے سارے خواب پریشان ہوتے دکھائی دینے لگے۔ اب کیا ہو گا شبانہ نے اسے زندگی کے کس بیانک موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ وہ ان ہی خیالات کے بھنور میں چکر کھاتا پرنسپل صاحب کے روبرو جا پہنچا۔ پرنسپل صاحب نے شبانہ کو چھیڑنے کا الزام اس پر عائد کرتے پوچھا۔

" تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔" نصرت سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ جیسے اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

وہ بیچارگی کی علامت بنا سر جھکائے کھڑا رہا۔ پرنسپل اسے اسٹیکٹ نہیں کیا صرف پچیس روپے جرمانہ کر کے چھوڑ دیا۔ یہی نصرت کے لئے سب سے بڑی سزا تھی۔ جس وقت نصرت گھر پہنچا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے ابھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلے گا۔ اس کی ماں نے یہ دیکھا تو گبھرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا بیٹے! چہرہ اس قدر اترا ہوا کیوں ہے؟"

"کچھ نہیں امی۔" کہنے کو تو وہ کہہ گیا لیکن اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کس طرح وہ اپنے منہ سے ایسی بات کہے یہ اور بات ہے کہ آج نہیں تو کل یہ خبر ان کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔ انہیں کتنا رنج ہوگا۔ نصرت کا سر چکرانے لگا۔ اس منحوس گھڑی کو کوسنے لگا۔ جب شبانہ اس سے ملی تھی۔

نصرت ابھی نہ جانے اور کتنی دیر اس طرح سوچ و فکر ڈوبا رہتا اگر جوتوں کی چاپ نے اسے چونکا نہ دیا ہوتا۔ نصرت کی نظر جب اٹھی تو سامنے دیکھا کہ اباجان کھڑے غصہ میں لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔ نصرت سہم گیا۔ اباجان نے اس کی ماں کو مخاطب کیا تے ہوئے کہا۔

"اپنے بیٹے کی کارستانی دیکھی۔"

"کیا ہوا۔؟" ماں نے شوہر کے تیور بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"آج تمہارے لاڈلے نے شبانہ نامی کسی لڑکی سے چھیڑ خانی کی تھی۔ اس لئے پچیس روپے جرمانہ ہوا ہے۔

"آپ نے غلط سنا ہو گا۔ کسی نے بے پر کی اڑائی ہو گی۔ میرا لڑکا ایسا نہیں۔"

"ہاں ہاں۔ تمہارے لڑکے میں گویا ہیرے موتی جڑے ہیں۔" ابا جان نے کہا۔ "کہنے والے جھوٹ کیوں کہیں گے۔ آج آتے پروفیسر ریاض نے بتایا۔ اس نالائق نے میرا نام مٹی میں ملا دیا۔"

نصرت نے چاہا کہ خود کو بے قصور ثابت کرے مگر وہ خاموش رہا۔ بچپن سے ابتک کی بے داغ زندگی ان کے سامنے ہونے کے باوجود انہوں نے اس واقعہ پر اعتبار کر لیا تو اب وہ کیا کہتا۔ اس غلط الزام نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ وہ سسک سسک رونے لگا۔

دوسرے دن وہ کالج جانے کیلئے تیار ہونے لگا۔ اچانک شبانہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

"لوفر۔"

ساتھ ہی ساتھ کالج کے لڑکوں کے قہقہے اس کے دماغ پر ہتھوڑے بنکر برسنے لگے۔ لڑکیوں کے طنزیہ فقرے اس کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہونے لگے۔ کالج کے پروفیسروں کی وہ نظریں جن میں اس کے لئے شفقت سے بھرپور خلوص تھا۔ ان نظروں سے اسے نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی نظر آنے لگیں۔ اس نے کالج جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور کسی کمزور عمارت کی طرح بستر پر دھم سے گر پڑا۔ جیسے اسے یوں لگا

رہا تھا۔ لوفر کا لفظ اور اس کے دامن میں پھیلی ہوئی بدنامی نے اس کے برسوں کی شرافت کو سر بازار ننگا کر دیا ہو۔ اس کی سادگی اور اس کی معصومیت کو ایک ملمع بنا کر رکھ دیا ہو۔ گھر باہر ہر جگہ اس کی عزت کو خاک میں ملا کر رکھدیا ہو اور جس آدمی کی کوئی عزت نہ ہو اسے دنیا میں جینے کا بھی کوئی حق نہیں ۔ وہ دن بھر کمرے میں بند پڑا یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ روتا رہا۔ یہ تمام باتیں لاوے کی صورت میں اسکے اندر ہی اندر پکنے لگیں ۔ ان تمام سوچ و فکر اور رنج و غم کا اس کی حساس طبیعت پر ایسا اثر پڑا کہ تیسری صبح وہ بخار میں تپ رہا تھا۔

یہ بخار دراصل اس آگ کی ظاہری تپش تھی جو پچھلے دو دنوں سے اس کے اندر سلگ رہی تھی۔ جیسے جیسے علاج ہو رہا تھا ۔ ویسے ویسے اس کی حالت بگڑ رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آگ اسکے وجود تک کو بھسم کر کے رکھ دے گی۔ نصرت کی بیماری کی خبر جب کالج میں پہنچی تو شبانہ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی مصلحت اتنا خطرناک رنگ اختیار کرلے گی۔ اس دن کے بعد سے تو وہ خود نصرت سے ملاقات کے لئے پریشان تھی تاکہ اسے اپنی مصلحت اندیشی کی تفصیل بتا کے معافی مانگ لے۔ بلکہ اس سلسلے میں اس نے ایک تفصیلی خط بھی لکھ رکھا تھا کہ اگر زبانی گفتگو کا موقع نہ مل سکا تو وہ اسے خط ہی دیدے گی۔ مگر وہ تو کالج ہی نہیں آیا۔

اور آج ــ آج اس کی علالت کی خبر آئی ۔ اس خبر سے وہ تلملا اٹھی ۔
اور پھر کالج سے گھر جانے کی بجائے وہ سیدھی نصرت کے گھر گئی ۔

نصرت کا کمرہ سامنے نظر آرہا تھا ۔ وہ دبے پاؤں نصرت کے کمرے کی طرف بڑھی ۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا ۔ والدہ اور دوسرے افراد شاید آنگن میں یا باورچی خانے میں کاموں میں مصروف تھے ۔
وہ نصرت کے سامنے آ کھڑی ہوئی ۔ نصرت بستر پر ساکت لیٹا ہوا تھا آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ۔ وہ پتھر کی مورتی کی طرح جوں کی توں کھڑی رہی ۔ دل میں ٹھیس اٹھی جو پہلے سے زیادہ تکلیف دہ تھی ــ اور طوفان کی طرح بھیانک ۔

" نصرت ! " آواز پہلے سے کچھ تیز تھی " مجھے معاف کر دو نصرت " " اس وقت میں اندھی ہو گئی تھی ۔ جو تم جیسے معصوم اور بے گناہ کو بدنام کیا ۔ تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا جو تھا ۔ میں بہت بد قسمت ہوں ۔ نصرت مجھے معاف کر دو ..... ؟ "
وہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی ۔ لیکن نصرت اس کی آواز کی رسائی کی حدود سے بہت دور جا چکا تھا ۔ ہمیشہ کیلئے ... "

زندگی کے موڑ پر

میں ناز سینما کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کی عمارت ایک خوبصورت وجیہہ عورت کی طرح ہے۔ بازار کی رونق شباب پر تھی ۔ ناز میں فلم "شری چار سو بیس" چل رہی تھی۔ چونکہ میں پہلے یہ فلم دیکھ چکا تھا۔ اس لیے دوبارہ دیکھنے کو دل نہ چاہا۔ چنانچہ میں نے فلم دیکھنے کی تجویز ترک کر دی۔ اپنے ہاتھ میں ہینڈ بیگ لٹکائے آگے بڑھا۔ میں نے سوچا کہ اب گھر چلنا چاہیئے۔

فٹ پاتھ پر کافی چہل پہل تھی۔ سبک رفتاری سے چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی لپکتا ہوا میرے قریب آیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی نوٹ بک کی ورق گردانی کرتا ہوا بولا۔

"جناب! ایک منٹ ٹھہریئے۔"

"فرمایئے؟" میں رک گیا اور نووارد کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ جو راہ چلتے آ ٹپکا تھا۔ آنکھوں پر عینک پتلے پتلے شیشے کے پیچھے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گنجی کھوپڑی۔ دھوتی اور واسکٹ میں کسی مارواڑی کا منشی نظر آ رہا تھا۔ اس نے گول سی چھوٹی ٹوپی بغل میں

دبا رکھی تھی ۔ اس نے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرا ۔ اور نوٹ بک میری آنکھوں کے سامنے کر کے بولا" کیا آپ کو یہ پتہ معلوم ہے ؟ مجھے ایک شخص سے ملنا ہے ۔ کئی گھنٹوں سے اس کی تلاش میں ہوں مگر ملتا نہیں"۔

" مجھے افسوس ہے میں نہیں جانتا" میں نے پتہ پڑھنے کے بعد معذرت چاہی ۔

" شاید آپ بھی کلکتے میں اجنبی ہیں " اس نے قیاس آرائی کی ۔

اجنبی تو نہیں ___ ہاں آنا کبھی کبھی ہوتا ہے ۔ دراصل میں کلکتے کے قرب و جوار کا رہنے والا ہوں ۔ کبھی کبھی فرصت کے وقت یہاں آجاتا ہوں"۔

" کیا آپ بھی پکچر دیکھکر نکلے ہیں ؟" اس نے سینما کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا ۔ جس کا میٹنی شو ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور لوگ آہستہ آہستہ سینما کے باہر نکل رہے تھے ۔

" جی نہیں " میں نے جواب دیا" یہ فلم میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں"

ہم دونوں گفتگو میں مشغول تھے کہ ایک شخص نے جھک کر ہمارے پاؤں کے پاس سے کوئی چیز اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی ۔ ہمارے استفسار پر اس نے کہا ۔

" بابو جی صابن کی ٹکیہ گر گئی تھی " یہ کہہ کر وہ چلتا بنا اور ہم دونوں گفتگو کرتے ہوئے آگے بڑھنے گئے ۔ عین اسی وقت ایک شخص روتا پیٹتا کوئی چیز تلاش کرتا ہمارے قریب سے گذرا ۔ میرے ساتھ والے شخص

نے پوچھا۔

"کیا ہوا بھئی! تم رو کیوں رہے ہو؟"

رووُں نہ تو اور کیا کروں۔ میری قسمت پھوٹ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے میں اس فٹ پاتھ سے گذرا تھا۔ میری جیب میں سونے کے دو ڈھیلے تھے۔ گھر پہنچکر مجھے جیب کے خالی ہونے کا پتہ چلا۔ اگر وہ کھو گئے تو میں کسی کام کا نہ رہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس کی آہ و زاری سے چند راہگیر بھی جمع ہو گئے۔

وہ سونے کے ڈھیلے کہاں گرے تھے۔ کچھ یاد ہے تمہیں؟

"نہیں بابو جی! — مگر مجھے یقین واثق ہے کہ وہ یہیں کہیں گرے ہوں گے۔ کیونکہ میں بس اس راستے سے گذرا تھا" وہ آنکھوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے بولا۔ اور ہمارا خیال اسی آدمی کی طرف چلا گیا جس نے ہمارے پاس سے کوئی چیز اٹھا کر صابن کی ٹکیہ کا بہانہ بنا دیا تھا۔

"ذرا بھاگ کر آگے جانا۔ کیونکہ ایک آدمی ہمارے پیروں کے پاس سے کوئی چیز اٹھا کر چلتا بنا ہے۔ شاید اس نے سونا اٹھایا ہے۔" وہ بیچارہ یہ سنتے ہی بدحواسی میں اس شخص کا حلیہ معلوم کئے بغیر تیز رفتاری سے جھپٹتا ہوا اسے ڈھونڈنے چلا گیا۔ اور ہم دونوں اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔

ہم لوگ ابھی کچھ دور گئے تھے کہ میرے ساتھ والے آدمی نے مجھے

کہنی سے ٹھونکا دیتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔ دیکھنا، یہ تو وہی شخص ہے جس نے ہمارے پیروں کے پاس سے سونا اٹھایا تھا۔" میں نے غور سے اسے دیکھا تو وہی شخص تھا جس نے صابن کی ٹکیہ کہہ کر اٹھائی تھی۔

"ہاں، وہی ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"کیا خیال ہے؟" اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ اور آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک عود کر آئی۔ میں نے مضطرب ہو کر اس سے پوچھا۔

"کیا خیال؟ میں سمجھا نہیں؟"

"مجھے وہ بیوقوف نظر آتا ہے۔ اگر ہم ذرا سا دھمکائیں تو سونا ہماری جیب میں...... کیا سمجھے.....؟" اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح سونا حاصل کر لیا جائے۔ میرے دل میں لالچ کا جذبہ چکر کاٹنے لگا۔ شیطان مجھے سونا حاصل کرنے پر اکساتا تھا۔ مگر شرافت و انسانیت مجھے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتی۔ پھر میں نے سوچا، کون دیکھنے آئے گا۔ مفت میں سونا مل رہا ہے۔ لے ہی لینا چاہیئے۔ میں شیطان کے بہکانے میں آگیا اور دھڑکتے دل سے کہا۔

"ٹھیک ہے، لیکن اسے کس طرح پھانسا جائے۔"

اس کے پاس چلنا چاہیئے۔ آخر وہ بچ کر کہاں جائیگا؟"

ہم دونوں اس کے پاس پہنچے تو ہمیں دیکھتے ہی پژمردہ اور مضمحل

نظر آنے لگا۔ اس کے بدن پر پرانی سی میلی بنیائن اور پتلون کا پائنچہ گھٹنوں سے ذرا نیچے تک مڑا ہوا تھا۔ سر کے بال الجھے ہوئے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ہونٹ خشک تھے۔

"وہاں سے کیا چیز اٹھائی تھی تم نے بتاؤ؟" میرے ساتھ والے آدمی نے اسے ڈانٹ کر پوچھا۔

جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ کچھ نہیں بابو جی۔" گھبراہٹ میں اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور سانس پھولی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ہمیں بہلانے کی کوشش بیکار ہے سچ سچ بتاؤ۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر اس سے کہا۔ "کیوں جناب! ہم اسے پولس کے حوالے کر سکتے ہیں۔ بے شک، پولس کی تھرڈ ڈگری اس سے سب کچھ کہلوا لے گی۔"

میں نے اس شخص کو گرفتار کروا دینے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "وہ۔۔۔۔۔ سونے کے ڈھیلے مگر۔۔۔۔ وہ ملتجیانہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ وہ شخص ہم لوگوں سے سخت خائف معلوم ہو رہا تھا۔ سخت کلامی سے وہ اور ڈر گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"بابو جی! میں غریب آدمی ہوں۔ مجھے پولس کے حوالے مت کریں۔ ورنہ میرے بال بچے بھوکے مر جائیں گے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"ایک شرط پر پولس سے بچ سکتے ہو۔"

"وہ کیا؟" اس کی باچھیں کھل گئیں۔ جیسے اسے کسی بڑی مصیبت سے چھٹکارا مل رہا ہو۔

"سونے میں ہمیں بھی حصہ دار بنا لو!" ہم نے الفاظ چبا کر کہے اور وہ کچھ سوچنے لگا۔ جیسے اپنے ذہن میں کچھ فیصلہ کر رہا ہو

"مجھے منظور ہے۔ میں سونا فروخت کر کے آپ کو چھ سو اور ان کو پانچ سو روپے دے دوں گا۔"

"میرے ساتھ والے آدمی نے اس آدمی کی طرف دیکھ کر کہا۔" ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ اسے کچھ روپے دے کر، ہم دونوں سونا لے لیں۔ یہ غریب آدمی ہے۔ سونا کہاں بیچتا پھرے گا۔"

میرے دل میں شیطان نے اپنا تسلط جما لیا تھا۔ میں نے سوچا دولت کی دیوی مجھ پر مہربان ہو چکی ہے۔ شاید اب قسمت کا ستارہ چمکنے والا ہے۔ میں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔" ہاں اسے کچھ روپے دیکر سونا لے لینا چاہیئے"

"تو پھر چلیں۔ کسی جگہ بیٹھ کر معاملہ طے کر لیں۔"

"کسی ہوٹل میں چلے چلیں۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

"نہیں، چونکہ ہوٹل میں بھیڑ ہوگی اس لئے ہم اچھی طرح گفتگو نہ کر سکیں گے۔"

تھوڑے فاصلے پر ایک میدان تھا جہاں بچے کھیل رہے تھے۔ وہیں پر ایک کنارے ہم نے ڈیرا جما لیا۔ میرے ساتھ والے آدمی نے اپنے جیب سے

دو سو روپے کے نوٹ اس آدمی کو دے دیئے۔ اور سونے کا ایک ڈھیلا لے لیا۔ سونے کی سنہری چمک سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ میں نے بھی جھٹ دس دس کے پانچ نوٹ نکالے اور اسے دے دیئے۔ وہ پچاس روپے پانے کے بعد مجھے سونے کا ایک ڈھیلا دیکر چلتا بنا۔ میں اور میرا ساتھی بے حد خوش تھے۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں نے اس آدمی سے رخصت ہوتے وقت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں لپکتا ہوا ایک رکشے پر سوار ہو گیا۔ ہینڈ بیگ کو گھٹنوں پر رکھ لیا۔ رکشا چل پڑا۔ اور میں خیالوں میں کھو گیا۔ نہ جانے کتنے ہوائی قلعے بنا ڈالے میں نے۔ اس وقت چونکا جب رکشا بہو بازار اسٹریٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے ایک سنار کی دکان کے سامنے رکشا رکوایا اور کرایہ چکانے کے بعد اندر داخل ہوا۔

سنار سے میری جان پہچان تھی۔ میں نے سونا اس کے حوالے کر کے دام پوچھا۔ وہ سونا ہتھیلی میں لے کر غور سے دیکھنے کے بعد میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ سونا نہیں۔"

مجھے دکان گردش کرتی نظر آنے لگی۔ یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے میں کسی غار کے نشیب میں گرا جا رہا ہوں۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"آپ کو شاید غلطی ہوئی ہو۔ غور سے دیکھئے۔ یہ سونا ہے۔"

میرے کہنے پر اس نے سونے کو دوبارہ جانچا اور سر جھٹک کر بولا۔

"سونا نقلی ہے۔ پیتل کے ٹکڑے پر سونے کا پالش کیا گیا ہے۔"
یہ سنتے ہی میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سنار کی ہتھیلی پر رکھا ہوا سونے کا ٹکڑا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ اب آہستہ آہستہ سب باتیں میری سمجھ میں آرہی تھیں۔ وہ تینوں شخص فراڈ تھے۔ یہ واقعہ جو میرے ساتھ پیش آیا۔ ان کی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔

ماڈل

اس دن دفتر میں قبل از وقت چھٹی ہوگئی۔ صابر سڑک کے کنارے کھڑا بس کا انتظار کرنے لگا۔ ہلکی ہلکی دھوپ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ شام کی ٹھنڈی ہوا سبک خرامی سے چل رہی تھی۔ کافی دیر ہوگئی لیکن بس نہ آئی۔ آخر کار وہ بور ہوکر پیدل ہی چل پڑا۔ راستے میں مصور جاوید کا گھر پڑتا ہے۔ جب اس کے گھر کے قریب پہنچا تو وہ ٹھٹک گیا۔ اور کسی انجانے خیال کے زیر اثر اندر داخل ہوا۔ مصور اس وقت ایک بھکارن کو ماڈل بنائے برش اور رنگوں سے کھیل رہا تھا۔ تصویر میں بھکارن محرومی اور یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا کرب اپنی پوری ہیبتناکی سے جلوہ گر تھا۔ مصور اسے دیکھ کر بڑے تپاک سے ملا۔

"آؤ۔ آؤ۔ بھائی صابر!"

کیا کوئی تصویر بنا رہے ہو؟ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ بھکارن پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" مصور نے رنگوں کی پلیٹ ایک طرف رکھدی اور برش دھونے لگا۔ "اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"بس آوارہ بادلوں کی طرح بھٹکتا رہا۔" اس نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"تم تو شاعر ہوتے جا رہے ہو۔"

"اور اپنے متعلق حضور کا کیا خیال ہے؟ مصور بھی کسی شاعر کے حسین خیال سے کم نہیں۔ اس میں لفظوں کی بجائے رنگوں کا ہیر پھیر ہے۔"

"خیر، اس وقت ایک ایسی شاہکار تصویر بنا رہا ہوں کہ انسان اپنا دل نکال کر رکھ دے گا۔" جاوید بولا "کل آرٹ گیلری میں تصویروں کا مقابلہ ہے۔ اس لئے یہ بھکارن ماڈلنگ کر رہی ہے۔ دعا کرو میری تصویر معیار پر پوری اترے اور حاصل نمائش قرار دی جائے۔" مصور نے بھکارن کی طرف اشارہ کیا۔

شاید تمہارے ذہن میں بھکارن کا کوئی اچھوتا آرٹ منڈلا رہا ہے۔ جب ہی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک بھکارن کو ماڈل بنائے ہوئے ہو؟ اس نے بھکارن پر ایک گہری نظر ڈالی "بھکارن کو کتنے پیسوں میں تیار کیا؟"

تمہارا کیا خیال ہے؟ مصور مسکرایا۔

شاید یہاں بھیک مانگنے آئی ہوگی۔ اور تم نے کچھ پیسوں کے عوض اسے ماڈل بننے پر راضی کر لیا ہوگا۔ نہ جانے ہمارے ملک میں انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کب تک روا رکھا جائے گا۔ بھوک آدمی کے غیور جذبہ کو روند ڈالتی ہے اور اس پر یہ عالم مجبوری جب بھکاری کا پیشہ اختیار

کرلیتا ہے تو لوگ نفرت سے دیکھتے ہیں۔ حکومت اور ہمارے رہنما اس کا جواز اور حل کیوں تلاش نہیں کرتے۔ یہ بھوک ہی ہے جب انسان کو ستاتی ہے تو اپنا ضمیر بیچ دیتا ہے۔ اور جب ایک عورت کو ستاتی ہے تو وہ اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔" اس کے چہرے پر کرب اور چیں بہ جبینی کے آثار دکھائی دینے لگے

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے جو دیکھتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی۔" مصور نے ایک تیز نظر بھکارن پر ڈالی۔ جو عجیب سی نظروں صابر کو دیکھ رہی تھی۔

"تعجب ہے کہ ایک فنکار کا دردمند دل رکھتے ہو تم ایسی باتیں کر رہے ہو!" مصور مسکرایا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے رنگ لاتے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ صابر غور سے بھکارن کا جائزہ لینے لگا۔ وہ یاس و محرومی کا پیکر تھی۔ الجھی الجھی گرد آلود زلفیں، آنکھوں میں غربت کی ویرانی اور بوسیدہ لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا جس سے اس کا گورا چٹا بدن جھلک رہا تھا۔ اس کے نقش و نگار اس قدر دیدہ زیب اور جاذب نظر تھے کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جائے۔ بھکارن بھی ایسی پری پیکر اور حسین و جمیل ہو سکتی ہے۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔ کبھی کبھی گدڑی میں لعل یا کیچڑ میں بھی کنول کھلتے ہیں۔ مگر زمانے کی ٹھوکروں نے کس طرح اس کا حسن پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ موسم بہار کا مرجھایا ہوا پھول معلوم ہو رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ بیحد مصیبت زدہ اور مجبور نظر آتی ہیں؟"
نہ معلوم کیوں وہ اس کے لئے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

"جی ہاں۔" اس کی آواز میں لوچ تھا جس سے زندگی کا درد ناک ساز چھڑ گیا۔ "میری زندگی غم و مصیبت کا سنگم رہی میں ابتک مسرت و شادمانی سے محروم رہی۔ فرحت و راحت کیا ہوتی ہے یہ میں نہیں جانتی۔ میں اس لطیف شئے سے محروم ہوں۔ میں نے بچپن میں جب آنکھ کھولی تو اپنے آس پاس سبھوں کو بھیک مانگتے پایا۔ کچھ لوگ میری جوانی خرید نا چاہتے تھے۔ میرے حسن کے پرستار ہزاروں پیدا ہو گئے۔ جو میری عصمت کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ پھر سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے کیا بیر؟"

میرے ماں باپ غریب و لاچار تھے۔ وہ میری جوانی کی حفاظت کس طرح کر سکتے تھے۔ میں اکثر گھروں میں برتن مانجھنے یا جھاڑو دینے کا کام کرنے لگی۔ مگر وہاں بھی ہوس پرستوں کی للچائی ہوئی نظریں مجھ پر پڑنے لگیں۔ ادھر چند دنوں سے میرا باپ سخت بیمار تھا۔ دوا دارو کے لئے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے نا۔ جب ہمیں کھانے کے لئے سوکھی روٹی ہی نہیں ملتی تو پھر دوا کے لئے پیسے کہاں سے لائیں؟ میں جگہ جگہ پیسے مانگنے گئی مگر سب ہی میری بھرپور جوانی کی قیمت لگانا چاہتے تھے۔ میں بھٹکتی بھٹکتی ان تصویروں والے بابو کے پاس آئی تو انہوں نے کچھ پیسوں کے عوض مجھے یہاں بٹھالیا۔"

" مگر تم بھیک کیوں مانگتی ہو ؟"

" اب بھیک نہ مانگوں تو کیا طوائف بن جاؤں ؟"

تم دنیا کی ستائی ہوئی معلوم ہوتی ہو، شادی کیوں نہیں کر لیتیں ؟"

" شادی ـــ! بابو ایک بھکارن سے کون شادی کرے گا۔ ویسے کچھ لوگ تیار ہو ہی جائیں گے، پھر چار دن کی چاندنی اور اندھیری رات !"

" دنیا میں سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے ۔"

تو پھر آپ ہی کیوں نہیں کر لیتے مجھ سے شادی ۔" بھکارن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی اور لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ۔

" ہیں ..... میں ..... " وہ گھبرا سا گیا۔

" کیوں ؟ ـــ میں نہ کہتی تھی کہ دھواں دھار تقریر کرنے والے ہزاروں مل جائیں گے۔ مگر جب انکی باری آتی ہے تو بوکھلا جاتے ہیں۔" اسکے لبوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی ۔

صابر سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ جاوید اندر کمرے میں نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ اس نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔ اس لئے اس سے ملے بغیر خیالات کے ہجوم میں گھر واپسی کیلئے باہر نکل آیا۔ بھکارن کی گفتگو نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

صابر میری ٹائم کے دفتر میں کلرک تھا۔ عرصہ تک بی اے کی ڈگری

جیب میں ڈالے نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ نو ویکینسی کا بورڈ دیکھتے دیکھتے وہ نوکری سے مایوس ہو چکا تھا۔ جوتے کے تلے گھس گئے تھے۔ روزانہ اخبار دیکھتا اور جہاں کہیں بھی نوکری کی ضرورت کا اشتہار دیکھتا۔ جھٹ پٹ عرضی روانہ کر دیتا بعض دفعہ انٹرویو کیلئے بلایا جاتا لیکن شومئی قسمت سے انجام ٹائیں ٹائیں فش ہی ہوا کرتا۔ بالآخر کافی کد و کاوش کے بعد اس نے اس وقت نوکری پائی جبکہ آرزو جوان ہو کر بوڑھی ہو چکی تھی۔ یاس کے دیپ بجھ چکے تھے۔ تب نوکری نے اسے خوش آمدید کہا۔

تنخواہ ڈیڑھ سو روپے تھی۔ اس منہگائی کے دور میں بمشکل ہی پورے ماہ کا خرچ چلا سکتا تھا۔ طعام اور دیگر اخراجات کے بعد اس کے پاس بمشکل ہی کچھ روپے بچ سکتے تھے۔ وہ بس کے کرایہ کی نذر ہو جاتے اکثر وہ پیسے بچانے کیلئے گھر سے دفتر کی طرف پیدل چل پڑتا۔ تاکہ بچے ہوئے روپے سے کتابیں خرید سکے۔ اسے ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ کتابوں کا مطالعہ اس کے دماغ کو جلا بخشتا۔ اس کے شعور میں معلومات کی کلیاں شگفتگی و تازگی کا نیا باب کھولتیں اور وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا جو خوابوں سے نزدیک اور بیداری سے دور ہوتی ہے۔

اس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ والدین بچپن میں مر چکے تھے۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو چچا کا دست نگر پایا۔ چچا ہی اسے تعلیم دلوائی۔ اس نے فرسٹ ڈویژن میں گریجویشن کیا تھا کہ ملک کا بٹوارہ

ہو گیا۔ شہروں میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ایک انسان دوسرے انسان کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ماؤں بہنوں کی عصمت لوٹی جا رہی تھی۔ ہر طرف آگ ہی آگ، خون ہی خون تھا۔ انسانیت ننگی ناچ رہی تھی۔ اس فساد میں اس کے خاندان کے کل افراد مارے گئے۔ چچا جو آخری سہارا تھے۔ وہ بھی اس خونی کھیل میں اس سے جدا ہو گئے۔ بمشکل وہ اپنی جان بچا کر مہاجر کی حیثیت سے پاکستان چلا آیا۔ بے خانماں و برباد لوگوں کا ایک سیلاب تھا۔ جو پاکستان میں امنڈ آیا تھا۔ ہر طرف بھوک، بیکاری اپنے قدم جما رہی تھی۔ اس کا وجود لاکھوں مہاجرین میں ایک حقیر کیڑے کی مانند تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بھوک اور بیکاری سے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ آخر کار اس کی کوشش رائیگاں نہ گئی۔ اور وہ نوکری پانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ جاتا اور فائلوں سے نپٹنے لگتا۔ دفتر میں نہ کسی بحث میں حصہ لیتا اور نہ ہی کسی سے کچھ سروکار رکھتا۔ لنچ میں اسکے ساتھی زمانے بھر کی سیاست کے متعلق تبصرہ و تنقید کرتے رہتے۔ مگر وہ ان باتوں میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا تھا۔ اسکے ساتھی اسے بالکل ہی "خشکی" سمجھتے تھے۔ بسا اوقات دبے دبے لفظوں میں اسے جب پیر یا پیر مجاری کہہ کر تاؤ دلانا چاہتے۔ مگر ان باتوں سے اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی وہ ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے اڑا دیتا۔ جب کلرکوں نے دیکھا

کہ وہ ان کی باتوں کا اثر ہی نہیں لیتا تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔

اس شہر میں وہ یکا و تنہا تھا۔ اس کی زندگی اس کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تھی جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ نہ صرف کم گو تھا۔ بلکہ حساس دل بھی تھا۔ جب کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھتا تو اس کا دل بھر آتا اور حتی المقدور اسکی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ نہ ہی اس نے کسی سے میل جول بڑھایا تھا اور نہ دوستی۔ لے دیکر ایک مصور تھا جس کے پاس اکثر اوقات وہ چلا جایا کرتا تھا۔ وہ فنکار سے اکثر مصوری کے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کیا کرتا۔ اور خاموشی سے آرٹسٹ کو برش سے کینوس پر تصویر بناتے دیکھا کرتا۔ جب وہ دو رنگوں کی آمیزش سے تیسرا رنگ بناتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ زندگی اور موت کے امتزاج سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ کچھ تصویریں ایسی بھی ہوتیں جن کی آڑی ترچھی لکیروں سے ایسا جان پڑتا جیسے زندگی غم و خوشی اور مسرت و آنسو کا جو غا پہنے معصومیت کے ساتھ خاکے میں اجاگر ہے۔ اسے بھی پینٹنگ سے لگاؤ تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے فائن آرٹ لے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ آرٹسٹ سے مصوری کی مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

مصور اسکے اس جذبے کی بیحد قدر کرتا تھا۔ چنانچہ وہ نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا۔ بلکہ مصوری کے نئے نئے گر بھی بتایا کرتا تھا۔ مصور جاوید ایسی تصویریں بنایا کرتا جس میں رنج و غم کی

پر چھائیاں جاگزیں ہوتیں۔ المناک ماحول کی تصویر کشی میں وہ ماہر تھا۔
ایسی تصویریں بنایا کرتا جس سے حقیقت کا گمان ہوتا اور یہی فن کا معراج
تھا۔ اسکے کمرے میں چاروں طرف بے شمار تصویریں آویزاں تھیں۔ کسی
میں قحط کے ڈراؤنے واقعات نمایاں تھے تو کسی میں بھوک دیو کی طرح
جبڑے پھاڑے انسان کو نگلنے کیلئے بے قرار تھی۔ کسی میں غریبوں کا کرب و
اضطراب تھا تو کسی میں بھکاریوں کی زندگی جلتی ہوئی آگ میں محصور تھی۔
یہ فن سالہا سال کی محنتوں کا نتیجہ تھا۔ وہ تصویروں پر تصویریں بناتا رہا۔
دن میں دو بار مشکل سے آدھے پیٹ کھانا نصیب ہوتا۔ اور کبھی تمام دن میں
ایک ہی بار اسے روٹی ملتی۔ فاقہ مستی، بے روزگاری اور تہی دستی کے باوجود
رنگ اور کینوس کی محتاجی سبھی کچھ جھیلتا رہا۔ لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔

آرٹ گیلری کی بلڈنگ نیلے، پیلے، سرخ، سبز قمقموں سے اس
طرح سجی ہوئی تھی جیسے آسمان پر تاروں کا جال، پارکنگ شیڈ پر کاروں
کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ شہر کی انٹلکچول متمول گھرانے کے لوگ، افسران بالا
اور آرٹ کے شیدائیوں سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس بھیڑ میں صابر
بھی ایک کونے میں کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ جاوید بھی ہال کے اندر
جاتا اور بے چینی سے باہر نکل آتا۔ استقبالیہ کمیٹی، چیف گیسٹ کا انتظار
میں بے صبری کا اظہار کر رہے تھے۔ جن کے آتے ہی انعام کا اعلان کیا جانے
والا تھا۔ جج صاحبان پہلے ہی سے آچکے تھے۔ انہیں صرف اپنے فیصلے سے

چیف گیسٹ کو آگاہ کرنا تھا۔ آخر خدا خدا کرکے وہ گھڑی آپہنچی اور شہر کے سب سے بڑے صنعت کار، تاجر، ممبر پارلیمنٹ کی شیورلیٹ روشنیوں کے سیلاب میں جگمگاتی ہوئی پورٹیکو میں آکر ٹھہر گئی۔ افسران منتظم اور تمام مصور تیزی سے گاڑی کی طرف لپکے۔ سیٹھ عثمان مسکراتے چہرے کے ساتھ گیٹ سے برآمد ہوئے اور باری باری سب ہی استقبال کرنیوالوں سے مصافحہ کیا۔

صابر پر جیسے حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ سیٹھ عثمان کے پیچھے پیچھے زرق برق میں ملبوس وہی بھکارن نمودار ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں شوخ قندیلیں روشن تھیں۔ تمام لوگ سمٹ کر ہال میں جمع ہوچکے تھے۔ سیٹھ عثمان اس ماہ رخ کے ساتھ ججوں کے درمیان جاکر بیٹھ گئے۔ ضروری کارروائی کے چند ہی منٹ بعد اناؤنسر نے بھکارن کی تصویر کو اول انعام کا مستحق قرار دیا۔ اس کے بعد سیٹھ عثمان نے فن اور فنکار پر ایک دھوئیں دھار تقریر کی۔

صابر حیرت اور سوچ کی کشتی میں ہچکولے کھاتا، اپنے مصور دوست کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دینے پہنچا۔ تب جاوید نے ہنستے ہوئے صابر کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

یار بات یہ ہے کہ سیٹھ صاحب کی صاحبزادی حسنا

ایڈونچر کی دلدادہ ہے اور اکثر شوقیہ ماڈلنگ کا کام بھی کرتی ہے۔ اس دن اس نے ایکٹنگ کی انتہا کردی۔ علاوہ ازیں مجھے منع کر رکھا تھا۔ کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ بتاؤں۔"

عین اسی وقت اناؤنسر نے اعلان کیا "مسعود جاوید صاحب فوراً اسٹیج پر تشریف لائیں۔ اور ایک ہزار روپے کا نقد انعام حاصل کریں۔"

جب وہ اسٹیج پر پہنچا تو ماڈل اپنے ہی دست نازک سے مصور کو انعام دے رہی تھی۔

اور ہال پر زور تالیوں سے گونج رہا تھا۔

بھکاری کی سرگذشت

سردیوں کی ایک سہانی شام تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ خوبصورت پرندوں کی چہکار دلوں کو گدگدا رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک بلند معیار اور اچھوتا افسانہ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس وقت ذہن میں کوئی اچھوتا پلاٹ نہ آسکا جس سے میں مطمئن ہوتا۔ ذہن تھک سا گیا تھا۔ اور دل اداس ہو گیا۔ میز پر چائے اور کھانے کی چیزیں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ جس طرح میرا نوکر فضلو رکھ گیا تھا۔ میں کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہاں سے باہر کا حسین منظر نظر آرہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سورج ڈھل چکا تھا۔ اور شام کا سایہ آہستہ آہستہ ہر طرف چھا رہا تھا۔ ہر چیز نہایت دلکش اور جاذب نظر معلوم ہو رہی تھی۔ دور سے شہر کی روشنی ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھی۔ اودے اودے بادل آوارہ روحوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے تھے۔ پرندوں کے غول کے غول ہوا میں زقندیں بھرتے اڑتے جا رہے تھے۔

اچانک میرے کانوں میں کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز

آئی۔ میں کمرے سے باہر چلا گیا۔ جب میں صدر دروازے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ فضلو ایک بھکاری کو بھگا رہا ہے۔

میرے وہاں پہنچتے ہی فضلو چپ ہو گیا۔ بھکاری سسکیاں لے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اچانک اس کے آنسو رک گئے۔ جیسے غم کے آتش فشاں نے انہیں سکھا دیا ہو۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟" میں نے فضلو کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ بھکاری کھانا مانگ رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کھانا نہیں ہے، تو مچل گیا"۔ اس کے تلخ لہجے سے پھر بھکاری کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اور اس کی سسکیوں کی آواز تیز تر ہو گئی۔

میں نے اس بھکاری کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چیچک بھرے جھریوں دار چہرے پر گھنی بھویں، گھنی مونچھیں، اور داڑھی پھوس کا جھاڑ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کی جوت کھو بیٹھا تھا۔ جسم پر چیتھڑے لپیٹے ہوئے تھے۔ اور ہاتھ میں مٹیالے رنگ کی لاٹھی تھی جو اس کے اندھے پن کا سہارا تھی۔ جس کے سہارے وہ دنیا کی خاردار اور کٹھن راہوں کو طے کر رہا تھا۔ بغل میں ایک میلی سی جھولی تھی جو اس کی بھوک مٹانے میں مدد دیتی ہے۔

جی... ہاں... ہاں... بابو جی.. میں چار دن سے بھوکا ہوں مجھے کوئی کھانے کو نہیں دیتا۔ میری جھولی خالی ہے اور میرا پیٹ بھی!

میں کھانے کو ترس گیا ہوں۔ مگر سبھی مجھے حقارت سے دیکھتے ہیں۔ مجھے چاول کے بدلے گالیاں اور جھڑکیاں دیتے ہیں۔" آنسوؤں کے قطرے اسکے گالوں پر لڑھک آئے۔ اسکے ہونٹ کانپنے لگے اور اس کی روح سسکنے لگی۔

"اچھا، آؤ۔ میں تمہیں کھانا دوں گا۔" میں اس اندھے بھکاری کو سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ اور فضلو جو کچھ میرے لئے کھانے کے لئے لایا تھا۔ اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا، جلدی جلدی اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ مگر بھوک جیسے اس کی روح سے چمٹی ہوئی تھی۔ پلیٹ جلد ہی خالی ہو گئی۔ اور وہ اپنے ہاتھ سے خالی پلیٹ کو ٹٹولنے لگا کہ شاید کچھ چیزیں بچ گئی ہوں۔ میں نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ چائے کا نیم گرم گھونٹ اپنے حلق سے اتارنے لگا۔

"تم بھیک کیوں مانگتے ہو۔ کام کاج کیوں نہیں کرتے؟" میں نے اسے مشورتاً کہا۔ لیکن مجھے اپنے الفاظ کے کھوکھلے پن پر خود بھی خفت محسوس ہوئی۔ مجھے اپنا جملہ عجیب سا معلوم ہوا۔ بالکل بے معنی سا۔ کیونکہ ایک نحیف و ضعیف آدمی کے لئے کام کرنا کس قدر مشکل ہے، جبکہ اس کی آنکھوں روشنی بھی نہ رہی ہو۔

اس کے ہونٹوں پر طنزاً ہنسی پھوٹی اور ختم ہو گئی۔ وہ غمناک لہجے میں کہنے لگا۔" بابو جی! آجکل لوگ سوچتے ہیں کہ یہ ہٹے کٹے لوگ بھیک کیوں مانگتے ہیں؟ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کام کاج کیوں نہیں کرتے؟ پہلے میں

بھی ایسا ہی سوچا کرتا تھا۔ مگر اب ؟ ... کتنے ہی بھکاری ایسے ہیں جو کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ کون سا کام کریں ؟ آجکل ملک میں ہر طرف بیکاری پھیلی ہوئی ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بھکاریوں سے بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر ان کا کوئی رکھوالا نہیں۔ کوئی ان داتا نہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ بیکاری کو جلد از جلد ختم کرے۔ ورنہ دن بدن بھکاریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا ___ میں اور میرے ہزاروں ساتھی دن بھر بھیک مانگ مانگ کر گھناؤنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے سے ہزاروں قسم کے آدمی گذرتے ہیں۔ جھوٹے، فریبی، ظالم، شریف، بدمعاش، سبھی کے درشن ہوتے ہیں۔ بھکاریوں میں بھی ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے برے لوگ تو دھوپ چھاؤں کی طرح دنیا کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے ساتھیوں میں بہت سارے ایسے ملیں گے جو پہلے اچھی زندگی گذارتے تھے۔ مگر حالات کے ظالم ہاتھوں نے ان کا گلا گھونٹ دیا اور انہیں مجبوراً گھناؤنی زندگی بسر کرنی پڑی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انسان وقت کا غلام ہوتا ہے وقت انسان کو اچھے سے برا اور برے سے اچھا بنا دیتا ہے۔ ہم دن بھر بھیک مانگنے کے بعد رات فٹ پاتھ پر بسر کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی آپ بیتی کہتے اور سنتے ہیں۔ جن کپڑوں سے لوگوں کو گھن آتی ہے انہیں ہم دن بھر اپنے جسم سے لپیٹے رہتے ہیں۔ وہ روزانہ پسینے سے تر بتر ہو کر گرد سے اٹ جاتے ہیں۔ آخر کار تار تار ہو کر اپنی رہائی کے لئے معافی مانگنے لگتے ہیں۔

پھر بھی ہم انہیں اپنے جسم سے چپکائے رکھتے ہیں۔ مجھے زندگی میں تکلیف ہی تکلیف ملی ہے بابو جی! میرے دل میں نفرت کا ایسا ناسور پیدا ہو گیا ہے جو ہمیشہ رستا رہے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گالوں پر بہتے ہوئے کائنات کی لامحدود وسعتوں میں مدغم ہو گئے۔

مجھے اس سے ہمدردی سی ہو گئی اور ایسا جان پڑتا کہ اس نے کبھی اچھی زندگی گذاری ہے۔ میں اس کی درد بھری سرگذشت سننے کے لئے بیقرار ہو گیا۔۔۔۔ "تم نے زندگی میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں شاید تمہاری پچھلی زندگی آرام اور سکون سے گذری ہو؟"

"میں نے اپنے ماضی کو تھپک تھپک کر سلایا ہے بابو جی! مگر آج زخموں کو کھرچنا پڑے گا۔ اس کی سسکتی ہوئی روح سے زندگی کا غمناک ساز چھڑ گیا۔

"میرا گاؤں ہرے بھرے کھیتوں سے لہلہا رہا تھا۔ کسان جو اپنے کھیتوں کو خون اور پسینے دے دے کر سینچا کرتے تھے۔ وہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ان کی حسرتوں کا خون ہو گیا۔ پورے مشرقی بنگال میں خدا کا قہر نازل ہوا۔ وہ قیامت خیز طوفان آیا کہ جس کے نام ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے تناور درخت بھی سرنگوں ہو گئے ایسا گمان ہوتا کہ کسی دیوزادے نے اپنی غیر معمولی پھونک سے ساری جھونپڑیوں کو اڑا دیا ہو۔ ہزاروں بے قصور جانیں موت کی گہری نیند سو گئیں۔ انسان کی زندگی یکایک موت کے ہاتھوں میں سکڑ گئی تھی۔ گاؤں کی آدھی سے زیادہ آبادی۔ اس "سائیکلون" کی نذر ہو گئی۔

اور جو لوگ بچ گئے تھے وہ اس قہر الٰہی سے بچنے کیلئے گاؤں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میرے والدین اس بن بلائے آفت میں چل بسے۔ میں گاؤں کے چھوٹے سے اسکول کا ماسٹر تھا۔ اس حادثے میں، میں اپنی آنکھوں کی جوت کھو بیٹھا۔ کچھ ہی دنوں میں پورا گاؤں کھنڈروں کی طرح ویران ہوگیا۔ اور ہر طرف موت کا سناٹا مسلط ہو گیا۔ گلی کوچوں میں آوارہ کتوں کے علاوہ کسی انسان کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سوائے موت کی سی سنسنی اور ویرانی کے بھیانک سکوت کے کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ کچھ دنوں تک میں رضا کاروں کے کیمپ میں رہا جو مصیبت زدوں کی مدد کو آئے تھے۔ پھر میں شہر چلا آیا۔ اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی نہ تھا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مجبوراً مجھے بھکاری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اور میں بھکاری کے روپ میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ پہلے تو میں اس پیشے کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا اور اس زندگی کو جانوروں کی زندگی سے بدتر تصور کرتا تھا۔ اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج تو بھیک مانگ کر پیٹ بھر سکتے ہیں۔ مگر یہ ہٹے کٹے لوگ اس پیشے کو کیوں بدنام کئے ہوئے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو یہ گھناؤنی زندگی پسند ہے؟ مگر اب مجھے اصلیت کا پتہ چل رہا ہے کہ وہ گھناؤنی زندگی بسر کرنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ ان کی روح کیسے سسکتی ہے۔ دراصل باہری آنکھیں بند ہو جانے سے اندرونی آنکھیں کھل جاتی ہیں!!

"میں جس راستے پر بھیک مانگا کرتا تھا۔ وہاں بڑے بڑے لیڈر، سیٹھ، مذہبی پیشواؤں کا گذر ہوتا۔ وہ ہمیں دیکھ کر نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیتے۔ ہمارے دکھ تکلیف سننے کے لئے ان کے کان بہرے ہو گئے تھے۔ پولیس والے ہمیں فٹ پاتھ سے

دھکے اور گالیاں دے دیکر بھگتے، اور ہم جیسے کمزور انسانوں کو مجبوراً انکی گالیاں برداشت کرنی پڑتیں۔ اب میں خدا سے یہی دعا مانگتا ہوں کہ انسان کو چاہیے کچھ بھی بنانا مگر بھکاری مت بنانا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا پھوڑا ہے جس سے پیپ بہتا رہتا ہے۔ اور لوگ مکھیاں بن کر اسکے گرد بھنبھناتے رہتے ہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اتنے دنوں سے جو آتش فشاں اسکے دل میں سلگ رہا تھا وہ پھٹ پڑا۔

اس کی سرگذشت سن کر میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ جاگ اٹھی۔ میں گہری فکر میں ڈوب گیا۔ اس بھکاری کی آپ بیتی سن کر میں غمزدہ ہو گیا۔

"اچھا بابوجی! اب میں چلتا ہوں۔ آپ کو خدا سلامت رکھے۔ آپ نے غریب بھکاری کی بھوک مٹائی ہے، خدا آپ کو اس کا اچھا اجر دے۔" اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں چونک پڑا۔ میری جیب میں جتنی ریزگاری تھی۔ نکال کر اس کی جھولی میں ڈال دی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور لاٹھی ٹیکتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اسکی لاٹھی کی کھٹ کھٹ میرے دماغ میں ضرب لگاتی رہی اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا۔ کہ میرے ملک سے بھوک ختم کب ختم ہو گی اور کب ضرورت مندوں کے لئے ایسے منصوبے بنائے جائیں گے جن پر عمل کر کے ملک کا ہر باشندہ اپنا پیٹ بھر سکے گا۔

روٹھ گئے دن بہار کے

سلمٰی باجی!

آج بہت دنوں کے بعد تمہیں خط لکھ رہی ہوں ۔ اس سے پہلے کبھی اس قسم کے مضامین کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کہ تم بذریعہ خط بھولی بسری یادوں کو از سرِ نو بیدار کروں گی ۔ ان دنوں میں سکون کی زندگی بسر کر رہی ہو ۔ تمہاری شادی کے دن ہی کتنے ہوئے ۔ صرف چند ماہ ۔ چاند کی روپہلی کرنیں ۔ پھولوں کی مہک اور موسیقی کا کیف تمہاری زندگی میں رچ بس گیا ۔ شوخ قندیلوں نے مسرت و شادمانی کو اپنے دامن میں لپیٹے تمہاری تاریک زندگی کو منور کر دیا ۔ نہ صرف تمہاری مراد بر آئی بلکہ ندیم بھائی کا خواب بھی پورا ہو گیا ۔ کیونکہ تم دونوں ایک دوسرے سے پریم کرتے تھے ۔

میری تو یہی تمنا ہے کہ تم دونوں خوش و خرم اور شاد و آباد رہو ۔ شادی سے پہلے تم پر تیز ہوا کا جھونکا آیا اس سے محبت کی لو پھڑ پھڑا اٹھی تھی ۔ مگر چراغ محبت بجھا نہیں ۔ آج تم مجھ سے کافی دور ہو اس لئے یادوں کا چراغ جلائے بیٹھی ہوں ۔ بیتی باتیں چور

دروازے سے آکر بھولی بسری یادوں کو ڈسنے لگی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی یادوں کے ریگستان میں زندگی کے انمنٹ نقوش کی کاشت کر رہا ہے اور یاد ہی تو ہے جو میرے ذہن کے سبزہ زار میں لہلہا رہی ہے۔

ندیم بھائی کے ساتھ تم پہلی بار کب ملی تھی؟ مجھے معلوم نہیں تم تمام باتیں مجھ سے صاف صاف نہیں بتا سکتی تھیں۔ کیونکہ بہن ہونے کے ناطے شرم دامن گیر تھی۔

سلمیٰ باجی! میں پرانی باتیں دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر کیا کروں، حالات ایسے ہیں کہ بغیر اس کے چارہ نہیں۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اور فرائض کے شکنجے میں اس بری طرح جکڑ دی گئی ہوں کہ شرافت اور انسانیت کو مرنے نہیں دے سکتی۔ آخر میں بھی ایک انسان ہوں۔ میرے بھی سینے میں ایک حساس دل ہے۔ میرے آنکھوں کے سامنے کتنے ہی انسان اس دیارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ مجبور، بیمار اور لاچار آدمیوں کی چیخ و پکار اور آہ و زاری سن سن کر پاگل سی ہو جاتی ہوں۔ اور اپنے آپ کو بظاہر سخت دل ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز میں تصنع اور بناوٹ ہے۔ پتہ نہیں لوگوں نے کیسے سمجھ لیا کہ ڈاکٹر کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل نہیں ہوتا اور وہ سنگدل ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اگر ڈاکٹر مجبور و بیکس انسانوں کو دلاسا نہ دلائے تو دنیا میں رہنا دوبھر ہو جائے۔ چنانچہ حالات کے تحت ہمیں بظاہر ہشاش بشاش رہنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر کی چند میٹھی باتیں امرت کا کام کرتی ہیں۔

انسان مدتوں کے بعد بھی اپنوں کو نہیں بھول سکتا۔ تین ماہ سے ان کی تیمارداری کر رہی ہوں۔ روزانہ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد جب وہ سو جاتے ہیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر چلی جاتی ہوں۔ مگر آج ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ انہوں نے اس دنیا کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ دیا ہے۔ آج بھی فلک سے سینکڑوں ستارے ٹوٹ گر گرتے ہیں مگر کون اس کا حساب رکھتا ہے۔ ہاں تو وہی انور بھائی میرے مریض تھے جو آج دنیا میں نہیں ہیں۔

انور بھائی ہمارے بڑے بھائی کے دوست تھے۔ اس نسبت سے ہمارے گھر ان کی آمد و رفت ہوتی تھی۔ تمہیں سب باتیں یاد ہیں نا باجی! تمہارے حسن و جمال سے وہ بے حد متاثر تھے اور دل ہی دل میں تمہاری پوجا کیا کرتے تھے۔ ایک بار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے تمہیں پریم پتر لکھا لیکن اس کا جواب تم نے کیا دیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے؟ پھر تم نے خشمگیں لہجے میں کہا تھا۔ "یہ ہے تمہارے خط کا جواب!"

سلمٰی باجی! اس وقت میں تمہیں غصے میں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ کیونکہ میں ندیم بھائی اور تمہیں بے حد چاہتی تھی۔ اور تمہیں ندیم بھائی کی بیوی کے علاوہ اور کسی روپ میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بعد میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے لاہور میڈیکل کالج چلی آئی۔ ان دنوں آپ پنڈی میں تھیں۔ کبھی کبھار ندیم بھائی سے

لاہور میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ کیونکہ ندیم بھائی یونیورسٹی میں فائنل ایئر کے طالب علم تھے۔

شہر کی ہنگامہ خیز زندگی میں تمام پرانی باتیں بھولنے لگیں۔ میڈیکل کالج میں اتنی محنت اور مشغولیت ہوتی ہے کہ دنیا کی دیگر چیزوں کو فراموش کر دینی پڑتی ہے۔

اس دن نائٹ ڈیوٹی تھی۔ فورتھ ایئر کے طلبا و طالبات کو عموماً نائٹ ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔ اس روز بیس نمبر وارڈ میں میری ڈیوٹی لگی تھی۔ رات تاریک تھی۔ ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی بارہ کے ہندسے پر پہنچ چکی تھی۔ سارا ہسپتال خاموشی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً مریضوں کی کھانسی، کرب اور کراہنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے نیند سی آنے لگی تھی۔ اس لئے وقت کاٹنے کیلئے افسانوں کی ایک کتاب پڑھنے لگی۔ اچانک آواز آئی۔

سسٹر! پانی......

اس وقت وارڈ کی نرس دوا لانے کیلئے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کتاب رکھکر دس نمبر بیڈ کے پاس گئی۔ مدھم روشنی کی وجہ سے مریض کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس دیکھکر اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ اسکے بعد پھولتی ہوئی سانس کے ساتھ پیر پھیلا دیئے۔ اس پر غنودگی طاری تھی وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آہ سلمٰی! اللہ مجھے معاف کردو!"

تمہارا نام مریض کے منہ سے سنکر میں چونک پڑی۔ عین اسی وقت دوسرا مریض درد سے کراہنے لگا۔ مجھے مجبوراً اس کی مزاج پرسی کیلئے جانا پڑا۔ ایک ڈاکٹر کیلئے آدھی رات کو کسی کی بڑبڑاہٹ سننے کیلئے وقت نہیں ہوتا بلکہ مریض کے دکھ درد کو کم کرنے کیلئے عملی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ صبح ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد جب ہوسٹل میں واپس گئی تو تمہارا واقعہ یاد آگیا۔ ساتھ ہی گذشتہ رات کے مریض سے تمہارا نام میرے خیالوں کو جھنجھلانے کیلئے کافی تھا۔

اس کی خیریت دریافت کرنے کو بڑا جی چاہ رہا تھا۔ مگر شب بیداری اور تھکاوٹ کی وجہ سے بھول گئی۔ دوسری رات جب ڈیوٹی پر واپس پہنچی تو انور بھائی کو اس ناگفتہ بہ حالت میں دیکھ کر تو سنگدل انسان کا دل بھی پگھل جاتا۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ یہی وہ انور بھائی ہیں جن کے حسن کی شہرت تمام کالج میں تھی۔ ان جیسا حسین وجمیل اور بانکا نوجوان پورے شہر میں نہیں تھا۔ انہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر تمام پچھلی باتیں سینما کی متحرک تصویر کی طرح نظروں کے سامنے گھوم گئیں۔

اچانک کسی نے میرے نام سے مجھے پکارا۔ جب غور سے تو دیکھا انور بھائی کی پیشانی پر تحیر کی شکنیں نمودار تھیں۔ وہ مجھ سے مخاطب تھے۔ میں ان کے قریب آگئی۔ انور بھائی! شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔

پھیکی ہنسی کے ساتھ انہوں نے مجھے اپنے بغل میں بیٹھنے کو کہا۔

تمہیں میں نے کل رات ہی پہچان لیا تھا رضو!

مجھے پہچاننے کے بعد ان میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ پھر ان کی کھوئی کھوئی آنکھیں کچھ جاننے کیلئے بے چین تھیں۔ انکے لبوں پر ہنوز بے جان سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ چند منٹ تک یہ کیفیت ان پر طاری رہی پھر آنکھوں میں چھلکتا ہوا سوال اور لبوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا اور وہ درد و غم کا مجسمہ نظر آنے لگے۔

سلمیٰ باجی! اس دن انور بھائی کے کرب کو دیکھ کر ظالم کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتا۔ عرصہ کے بعد جب ایک آشنا صورت نظر آئی تو وہ اپنا درد و غم سب بھول گئے۔ دھیمی آواز میں انہوں نے اپنی زندگی کا غمناک ساز چھیڑ دیا۔

تمہارے پاس سے شکست و محرومی کا بوجھ لئے انور بھائی پنڈی چھوڑ کر لائل پور چلے گئے۔ اور تمہیں بھول جانے کیلئے تندھی سے کام میں مشغول ہو گئے۔ لائل پور کالج کا ہر اسٹوڈنٹ انہیں بے حد چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ بیحد سنجیدہ اور با اخلاق لیکچرار تھے۔

لیکن وہ وہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہیں سکے کالج کی سب خوبصورت اور مغرور لڑکی جس کے حسن کو چاند اور جوانی کو کنول کہتے تھے۔ دل و جان سے ان پر فریفتہ ہو گئی۔ انور بھائی آنرز کا ایک پیپر دیکھ رہے تھے۔ تو انہیں ایک خط ملا۔ انور بھائی خط پڑھنے کے بعد مسکرائے ساتھ ہی انہیں تمہاری

باتیں یاد آ گئیں۔ انہوں نے روزی کو پرائیویٹ روم میں بلا کر وہ خط واپس کر دیا۔ مغرور روزی نے اس میں اپنی ہتک محسوس کی۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے پاس شکایت کی کہ انور صاحب نے اس کے سامنے اظہار محبت کر کے اسکے جذبات کو ٹھیس پہنچایا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نمک مرچ لگا کر بات پھیلا دی۔ روزی وہاں کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی لڑکی تھی۔ اس لئے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی اس کی طرف داری کرنے لگا۔ انہوں نے تمام پروفیسروں کے سامنے انور بھائی کی بے عزتی کی اور ان سے ایکسپلینیشن کال کیا۔ لڑکے انہیں دیکھتے تو معنی خیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل جاتی اور کبھی کبھار طنزیہ فقرے بھی چست کر دیتے۔

سلمیٰ باجی! دنیا کے سینے سے سچائی اور انصاف مٹتا جا رہا ہے اس قدر بے عزتی ہونے پر انور بھائی نے اف تک نہ کیا۔ زخمی دل کے ساتھ بدنامی کا داغ لئے سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد ان کے نزدیک دنیا سے اعتبار ہی اٹھ گیا اور وہ گوشہ نشین ہو گئے۔ اس طرح وہ دن بدن تباہی کی طرف جانے لگے۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ بھلا آوارہ بادلوں کی کوئی منزل ہوتی ہے؟ کچھ ہی دنوں بعد انہیں کینسر ہو گیا۔ میں نے رپورٹ دیکھکر سمجھ لیا کہ انور بھائی بچیں گے نہیں۔ ان کی زندگی کے جتنے دن باقی رہ گئے تھے۔ میری خواہش تھی کہ خوش رہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ بہت سیریس کنڈیشن ہونے پر بھی ڈاکٹر مریض کو بچانے کی امید رکھتا ہے۔ یہ امید ہی تو ہے جو

مرتے دم تک انسان کو سہارا دیتی ہے۔

اکثر انور بھائی کو کہتی رہتی کہ تم اچھے ہو جاؤ گے اور تمہاری کھوئی ہوئی صحت تمہیں مل جائے گی۔ وہ غمگین مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے۔

کس کے لئے زندہ رہوں؟ رضو! ناکامی و محرومی میری روح سے چمٹ گئی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے زندگی کے باغ میں امید کا پودا لگایا تھا وہ پہلے ہی مرجھا گیا۔ امید و بیم کی زندگی گھسیٹتے گھسیٹتے میں تھک گیا ہوں۔ پھر سوکھی ہوئی ندی میں لہریں کہاں؟ جو میں زندہ رہنے کی تمنا کروں؟۔

پرسوں صبح انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ کئی دنوں سے وہ باتیں کرنے میں تکلیف محسوس کرتے تھے۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے "اس سے کہنا کہ مجھے معاف کردے۔ بڑی امید تھی کہ مرنے سے پہلے دونوں کو شاد و آباد دیکھ لوں گا۔ مگر یہ موت میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں اسی لئے دور ہی سے دونوں کو شادی کے تحفے میں اپنی زندگی کی مالا بھینٹ کرتا ہوں ـــــ " ایک آرزو اور ہے۔ سلمیٰ سے کہنا کہ میری قبر پر کھڑی ہو کر آنسو کے دو گرم گرم قطرے گرائے۔ اس سے میری پیاسی روح کو تسکین پہنچے گی۔"

سلمیٰ باجی! پتہ نہیں تم دونوں کی کہانی لکھتے لکھتے میری آنکھوں میں آنسو کیوں جھلک آئے ہیں.....؟

بات اک رات کی

برسات کا موسم تھا۔ پھوہار پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پانی کی موٹی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ پلیٹ فارم کی چھت تلے میں بارش سے محفوظ تھا۔ بوندوں کے پڑنے سے ہوا میں خنکی بس گئی تھی۔ رفتہ رفتہ ہلکی ہلکی بارش زور پکڑ چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر بے حد بھیڑ تھی۔ ٹرین کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگوں کی چیخ و پکار سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ دوسرے مسافروں کی طرح میں بھی ٹرین کے انتظار میں کھڑا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور کاندھے پر ایر بیگ تھا۔ میں نے قلی کو اپنا سوٹ کیس تھما دیا جو میرا ٹرنک اور ہولڈال سر پر لئے قریب ہی کھڑا تھا۔ ٹرین ٹھیک اپنے وقت پر چھک چھک کرتی، دھواں اڑاتی پلیٹ فارم پر آکر ٹھہر گئی۔ چونکہ ٹرین صرف چند منٹ ٹھہرتی تھی۔ اس لئے میں قلی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے بارش میں بھیگتا ہوا سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف لپکا۔ ابھی میں کمپارٹمنٹ میں داخل بھی نہ ہو سکا تھا کہ انجن نے اپنی روانگی کی سیٹی دی۔ قلی سے جلدی جلدی اپنا سامان کمپارٹمنٹ کے اندر پھنکوایا اور اسے پیسے چکا کر رینگتی ہوئی ٹرین پر اچک کر سوار ہو گیا۔ ٹرین رفتار پکڑ چکی تھی۔ میں نے اطمینان کی

سانس لی۔ مگر جب میری نظریں کمپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگیں تو مجھے احساس ہوا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی اندر موجود ہے۔ اور وہ وجود ......
جیسے کمپارٹمنٹ میں حیرت کا پٹاخہ پھٹ پڑا ہو۔ وہ خود ایک پٹاخہ سے کم نہ تھی۔ اور آج کل کے ماڈرن زمانے میں اسے ایٹم بم کا خطاب بھی دیا جاسکتا تھا۔

رعنائی وزیبائی کے اس پیکر کی سحر طراز آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور دل میں پیوست ہوتی جارہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں اخبار تھا۔ چھت پر رم جھم بوندوں کا ساز بج رہا تھا۔ گلابی گال پر پانی کے قطرے اس طرح جھلملا رہے تھے جیسے سرخ وسفید سیب پر شبنم کے قطرے ہیروں کی طرح قوس وقزح بکھیر رہے ہوں۔ بے شک وہ بیحد حسین تھی۔ اس کے لب، لپ اسٹک سے بے نیاز ہوتے ہوئے بھی فطری طور پر ہلکے گلابی رنگ کے تھے اور دانت ہیرے جیسے چمکدار اور چھوٹے چھوٹے تھے۔

اس کی آنکھیں بڑی اور سحر طراز تھیں اور ان آنکھوں خمار بھی تھا۔ اس کے لبوں پر بہت ہی معصوم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ زلفِ بنگال کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ دو دو ناگن اس کے شانوں تک لٹکی ہوئی تھیں۔ بال سیاہ، گھنگھریالے اور بہت ہی دلفریب تھے۔ اس نے سرخ رنگ کی ساری باندھ رکھی تھی۔ اس کا بلاؤز بھی سرخ ہی تھا۔ ہاتھ شانوں تک ننگے تھے۔ بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سنہری گھڑی

ستاروں جیسی چمک رہی تھی۔ جسم کی تمام خوبصورتی اسکے سینے میں سمٹ آئی تھی۔ اچانک ہوا کے لطیف جھونکے سے اسکی ساری کا پلو ڈھلک گیا۔ اور پیشانی پر زلفیں بکھر گئیں۔ اس کے سینے کے زیر و بم سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دو سرخ غبارے مائل پرواز ہوں۔ وہ اپنی ساری کا پلو درست کرنے لگی اور میں نے ٹرنک، سوٹ کیس کو اوپر کے برتھ پر رکھ دیا اور ہولڈال سے بستر نکال کر دوسرے برتھ پر بچھا دیا اور ہولڈال کو اس کے سر کے اوپر والے برتھ کو خالی دیکھ کر رکھنے لگا تھا کہ ہولڈال سے چمڑے کا بیلٹ نکل کر اس پری رو نازنین پر گر پڑا۔

"اوہ، معاف کیجئے گا" میں معذرت کرنے لگا "چوٹ تو نہیں آئی۔"

"جی نہیں" اس کی نشیلی آنکھیں روشن ہو گئیں اور میں کھو سا گیا۔

میرے آنے سے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی" میں نے پوچھا کہ شاید میرا اتنہا وہاں رہنا اسے کھل نہ رہا ہو کیونکہ ہم دونوں کے سوا کمپارٹمنٹ میں کوئی نہ تھا۔

بھلا مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہم سفر ہو تو سفر اچھا کٹ جاتا ہے" کافی آزاد خیال اور اسمارٹ معلوم ہوتی تھی۔ اسکے لہجے کی شبنمی جھنکار سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دور کسی جنگل میں کوئی حسینہ دھیمے سروں میں ستار بجا رہی ہو۔

بھلا مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔

میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور ایر بیگ سے رسالے نکال کر یونہی ورق گردانی کرنے لگا۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی اور دوسرے برتھ پر حسن و عشق کی پری جلوہ افروز تھی۔ میرا دل گنگنا رہا تھا۔

ساقی بھی ہے چمن بھی ہے ٹھنڈی ہوا بھی ہے :: ٹوٹے جو آج توبہ تو لے دل مزا بھی ہے
رگ رگ پھڑک رہی ہے نیا رنگ دیکھ کر :: قاتل بھی ہے چھری بھی ہے میرا گلا بھی ہے

دور کسی خیالی جزیرے میں کوئی حسینہ بربط کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی اور نغمہ فضا میں بکھر کر موسم کو بھی گنگنانے پر مجبور کر رہا تھا۔
۔" ذرا وہ میگزین دیجئے گا"۔ کھنکتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گیٹار جھنجھنا اٹھا ہو۔ میں نے اپنا رسالہ اسے دے دیا۔ جسکے ٹائیٹل پیج پر ایک بت طناز کی تصویر تھی۔ جس کے نیچے میں نے ایک شعر لکھ مارا تھا۔ وہ رسالے کے سرورق کو غور سے دیکھنے لگی۔ شعر پڑھنے کے بعد اس کی نگاہیں میری طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

ادا آئی، جفا آئی، غرور آیا، حجاب آیا
ہزاروں آفتیں لیکر حسینوں کا شباب آیا

تھوڑی دیر میں ہم دونوں خاصے بے تکلف ہو گئے۔ اس قتالہ کا نام "شبانہ" غنچہ و گل، ماہ و انجم، کہکشاں حسین مناظر، حسن و جمال بن کر میرے تخیل پر چھانے لگے تھے۔ کتنا پیارا اور حسین نام تھا اس کا۔
" آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"اپنے دوست کے گھر۔" میرے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"آپ کے دوست کا گھر کہاں ہے؟" حسن نے پھر سوال کیا۔

"اسی سرزمین پر۔" عشق نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

"اوہ، آپ تو کافی دلچسپ آدمی ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"بھئی دل تو ہوا مگر یہ "چسپ" کیا بلا ہے؟"

"چسپ کے معنی چپکنا کے سمجھ لیں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"کیسے سمجھ لوں، میرا دل گوند تو ہے نہیں کہ ایرے غیرے کو چپکتا پھرے۔" میں نے جوابی حملے کئے۔ یہ سن کر وہ لجی سی گئی۔

انجن نے زور کی چیخ ماری اور دھواں اڑاتی گاڑی ایک بڑے اسٹیشن پر جا کر ٹھہر گئی۔ ٹرین یہاں پندرہ منٹ رکی تھی۔ رات کے سائے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ مگر آسمان ابر آلود تھا۔ مسافروں کا ہجوم اتر چڑھ رہا تھا۔ خوانچہ والوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک مسلسل ہنگامہ تھا۔ میں نے کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے ڈائننگ کار کے بیرے کو ایک سٹ چائے اور ہلکے ناشتے کا آرڈر دیا۔ اور وہ "ابھی لایا صاحب" کہتا ہوا دوڑ کر ڈائننگ کار کی طرف چلا گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں تمام لوازمات لئے آموجود ہوا۔ میں نے ٹرے سامنے والے برتھ پر رکھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹرے شبانہ کے بغل میں

رکھکر چلا گیا "۔ آپ نے یہ الّم غلّم منگوانے کی کیوں تکلیف کی "۔

" تکلیف کو تو خیر گولی ماریئے "۔ مگر آپ تکلف ضرور کر رہی ہیں "۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیں ۔ اسوقت تک ہم دونوں کے درمیان سے جھجک اور حجاب کا پردہ ہٹ چکا تھا ۔ اسکے بارے میں میں سب کچھ جان چکا تھا ۔ اس کا شوہر دن بھر فائلوں میں پھنسا ہوا ایک بہت بڑی فرم کا مینیجر تھا ۔ وہ اپنے میکے سے واپس اپنے شوہر کے پاس جا رہی تھی ۔

اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھا دی ۔ وہ میرے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھی ہوئی تھی ۔ میرے اندر بجلی کی لہر دوڑ رہی تھی ۔ اندیشہ ہوتا تھا کہ گردش خون کی وجہ سے رگ نہ پھٹ جائے ۔ اس کے سینے کا نشیب و فراز صاف نظر آ رہا تھا ۔ اس کی بھی کچھ ایسی کیفیت معلوم ہوتی تھی ۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے سینے میں اتنے زور سے بھینچوں کہ وہ مجھ میں سما جائے ۔ میرے جذبات انگڑائیاں لے رہے تھے ۔ میں از خود رفتہ ہوا جا رہا تھا ۔

" ایک بات کہوں ؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا ۔

" آپ بے حد حسین ہیں "۔ اس کی نشیلی آنکھیں جھک گئیں ۔ پھر اوپر اٹھیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انگ انگ میں نشہ چھا گیا ہو ۔ ترکش سے تیر نکل کر دل کے پار ہو گیا ہو ۔ اور مجھے غالب کا شعر یاد آ گیا ۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گئی

پھر رات کی گہری تاریکی چھا گئی۔ اور بادلوں کے دامن میں بجلی کی چمک لہرانے لگی۔ تاریک رات میں بادل نے اپنا تسلط جما لیا۔ ٹرین دندناتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی۔ اندر بارش کے چھینٹے آنے لگے تھے۔ اس لئے اٹھ کر میں نے دونوں طرف کی کھڑکیاں بند کر دیں۔ اور آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند کہاں ؟ سامنے برتھ پر وہ کسی حسین غزل کی طرح مسکرا رہی تھی۔ سینے سے ساری کا آنچل ہٹ گیا تھا۔ وہ خواب کی وادی میں کھو گئی تھی۔ اور میرے جذبات سسکنے لگے تھے آرزو مچلنے اور تمنا انگڑائی لینے لگی۔ میری کنپٹیاں سلگنے لگیں اور جسم تپنے لگا۔ سانس کی آمدو رفت تیز ہو گئی۔ لمحہ لمحہ بادل کی گرج بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی۔ وہ اسی طرح محو خرام تھی اور جذبات کا دھارا مجھے بہائے لئے جا رہا تھا۔ میں جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پاس گیا اور بیقرار ہو کر اسکے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ جاگ پڑی۔ میں بھونرے کی طرح اسکے ہونٹوں کا رس چوس رہا تھا۔ وہ شاید مجھ سے زیادہ بیتاب تھی۔ اس نے اپنے بازو میرے گلے میں حائل کر دیئے۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ میرے سینے سے آ لگی۔ جذبات کا دھارا اپنے راستے بہہ نکلا۔

ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی بھاگی جارہی تھی۔ صبح میری آنکھ اس وقت کھلی۔ جب قلی مجھے جگا رہا تھا "جناب اٹھئے، ریل گاڑی کب کی رکی پڑی ہے، تمام مسافر جا چکے۔"

میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ سب صحیح سالم تھا۔ وہ کافر جوانی کب کی جا چکی تھی۔ ابھی تک اسکے لمس سے بیخود ہوا جا رہا تھا۔ رات کا خمار ابتک باقی تھا۔ جلدی جلدی سامان قلی کے سر پر اٹھائے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ ٹیکسی میں پارک سرکس۔ کلکتہ کی ہنگامہ خیز زندگی، جہاں ہر طرف چہل پہل ہے۔ ٹیکسی بارونق بازاروں سے ہوتی ہوئی میری منزل مقصود جا پہنچی۔ میرا دوست گراؤنڈ فلور میں رہتا تھا۔ میں نے کرایہ دیا اور سامان برآمدہ میں رکھکر بٹن دبایا۔ دروازہ کھلا میں حیرت کا مجسمہ بنا رہ گیا۔ میرے سامنے وہی سرخ ساڑھی والی نازنین کھڑی حیرت سے مجھے تک رہی تھی اور میں اُسے۔ اس کے پیچھے میرا دوست کھڑا کہہ رہا تھا۔ بھئی ان سے ملو۔ یہ ہماری بیگم ——

چور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لاہور آیا تھا۔ رہائش نیو ہوسٹل میں تھی۔ کمرہ الگ ملا ہوا تھا۔ اجنبی جگہ، نیا ماحول، نئے لوگوں سے واقفیت پیدا کرنے میں مہینوں لگ گئے۔ شروع شروع میں دل بہت اچاٹ ہوا۔ پہلی بار گھر سے باہر نکلا تھا۔ ہوسٹل میں رہنے کا بھی پہلا اتفاق تھا۔ طبیعت بے حد گھبراتی اور بار بار گھر کی یاد ستاتی۔ آہستہ آہستہ لڑکوں سے مراسم بڑھتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ جی بھی لگ گیا۔ نئے نئے دوست ملے۔ نئی نئی باتیں ہوئیں۔ کبھی ان کے ساتھ شالامار، جہانگیر اور نور جہاں کا مقبرہ، شاہی مسجد اور شاہی قلعہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ تو کبھی باغ جناح، مال روڈ اور انار کلی کی سیر ہو رہی ہے کبھی راوی پر بوٹنگ ہو رہی ہے اور مجھ پر اداسی کے جو ماحول چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ گئے۔

گھر سے برابر خط و کتابت ہو رہی رہتی تھی۔ نہ صرف اپنی خیریت کی اطلاع دینی پڑتی تھی بلکہ لاہور کا آنکھوں دیکھا حال بھی لکھنا پڑتا تھا۔ لاہور جو لاہور ہے، تمام شہروں سے الگ اپنا حسن رکھتا ہے اور اس حسن میں بھی انفرادیت ہے۔ شہری زندگی ہر جگہ کی یکساں ہوتی ہے۔ مگر لاہور

میں شہریت کم ہی نظر آتی ہے۔ اس کا اپنا کلچر ہے، اپنی تہذیب ہے۔ اس میں تاریخ کے ہزاروں اوراق بکھرے پڑے ہیں جو عظمت رفتہ کی یادگار ہیں۔

ہفتوں سے گھر کی خیریت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ایسا اچانک ہی ہوا تھا کہ خط آنا بالکل بند ہو گیا۔ میں برابر خط لکھتا مگر جواب ندارد۔ رجسٹری سے بھی چیٹھی بھیجی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پریشانی لازمی تھی۔ کہیں گھر پر کوئی سانحہ نہ پیش آیا ہو، یا کوئی بات ایسی ضرور تھی جس کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہو رہی تھی۔ طرح طرح کے وسوسوں نے آگھیرا۔ دن گذرتا گیا اور خطوط کا بھی پڑھتا گیا۔ ایک روز میں لان میں بیٹھا دیوان غالب کے صفحات الٹ رہا تھا کہ جہانگیر خان آگیا۔

" یار۔ تم سے کوئی ملنے آیا ہے "۔ اس نے اطلاع دی۔

" کہاں ــ ؟ "

" ٹک شاپ میں "

میں لپکتا ہوا اندر داخل ہوا تو سارے ہال میں صرف دو افراد بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا سا شخص داڑھی، موٹے فریم کی عینک اور سر پر ٹوپی لگائے بادی النظر میں کسی اسلامی جماعت کارکن نظر آیا۔ اور دوسرا موٹا سا بڑی بڑی آنکھوں ہشاش بشاش شخص تھا۔ علیک سلیک ہوا۔ پھر انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ داڑھی والا محمود دشام تھا۔ جو کسی ہفت روزہ میں پارٹ ٹائم مدیر معاون کی حیثیت

سے کام کر رہا تھا۔ دوسرا اس کا دوست کا۔ یہ دونوں ایم۔اے فائنل کے طالب علم تھے۔ ہم بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔

خوب گپیں لگیں۔ موضوع گفتگو مشرقی پاکستان تھا۔ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ وہاں کے متعلق جاننے کے مشتاق تھے۔

"اچھا یہ بتایئے کہ واقعی بنگال میں بڑے بڑے جادوگر ہیں۔ جو باہر سے آنے والوں کو مکھیاں بنا کر دیوار سے چپکا دیتے ہیں۔" طارق نے عجیب سا سوال کیا۔

"جی نہیں۔ لوگوں نے بے پر کی اڑا رکھی ہے۔" میں نے بتایا۔

"در اصل بنگال گنگناتی ہوئی ندیوں۔ اڑتے ہوئے بادل۔ حد نگاہ تک جھومتے ہوئے ناریل کے درختوں کا دیس ہے۔ یہی وہاں کا حسن ہے اور یہی وہاں کا جادو۔ اس لئے جو بھی وہاں جاتا ہے۔ قدرتی حسن کے طلسم میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ اس بات کو ایک سیاح نے بلیغ انداز میں کہا تھا کہ بنگال میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں مگر وہاں سے نکلنے کا کوئی بھی راستہ نہیں۔"

"اچھا اچھا۔" محمود شام نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ بڑی روانی سے اُردو بولتے ہیں۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں صرف بنگلہ ہی بولی جاتی ہے۔"

"بنگال میں اردو کے بہت اچھے شعراء گذرے ہیں اور ان دنوں تو مشرقی پاکستان میں تقریباً اسّی لاکھ اردو بولنے والوں کی آبادی ہے۔

جن کا اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔"

"آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں۔" محمود شام کے دوست نے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔" کہیں ہماری وجہ سے بور تو نہیں ہو رہے ہیں۔"

"بالکل نہیں۔" دراصل کافی دنوں سے گھر کی خیریت معلوم نہیں ہوئی اسی لئے۔" میں نے حقیقت حال بتایا۔

ایسا تو عام طور پر ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے محکمہ ڈاک کا کیا کہنا کبھی کبھی چھٹے چھٹے مہینے بعد خط ملتا ہے۔"

" ایک بار میرے چچا نے اپنے پہنچنے کی اطلاع بذریعہ تار دی۔ مگر مکان پر انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے تار وصول کیا۔"

" محکمہ ڈاک زندہ باد۔ پتا نہیں دوسرے محکموں کا کیا حال ہے؟"

" سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ آخر کس کس کا گلہ کیا جائے؟" محمود شام نے اپنی گھڑی دیکھی اور پھر آئندہ ملاقات کا وعدہ کرکے رخصت ہو گئے۔

میں سیدھا آفس کی طرف گیا۔ شام کو پوسٹ مین آفس میں ڈاک دے جایا کرتا تھا۔ پھر چپراسی فضل کمروں میں خطوط ڈال جایا کرتا تھا۔ فضل خطوط تقسیم کرتا ہوا مل گیا۔

" آج تو آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔" اس نے بتایا۔" میں روزانہ آپ کے خطوط دروازے کی سوراخ سے اندر ڈال دیتا ہوں۔"

"مگر مجھے کافی دنوں سے کوئی خط نہیں ملا۔"

"میرا کام ہے کمروں میں خطوط پہنچانا۔ اور میں اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہوں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا چند دنوں میں آپ نے کوئی خط میرے کمرے میں ڈالا تھا؟"

"یہ بتانا مشکل ہے، مگر ٹھہرئیے۔" اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "پرسوں ہی میں دو خطوط ڈال گیا تھا۔"

"اچھی طرح سوچ لیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ حافظے کی غلطی ہو۔"

نہیں جناب میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں سات سال سے نوکری کر رہا ہوں اور مجھے اپنی یادداشت پر ناز ہے۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

اب میں چکرایا۔ آخر میرے خطوط سے کسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں کافی ہوشیاری سے کمرہ لاک کرتا تھا۔ ہمیشہ کمرے کی چابی میری جیب میں ہوتی۔ پھر وہ کون شاطر چور ہے جو میری آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا۔ البتہ ان دنوں میں ہوسٹل میں بے حد چوریاں ہو رہی تھیں۔ کبھی کسی کا سوٹ غائب ہے تو کبھی کسی کا ٹرانسسٹر۔ اگر سوٹ کیس میں زیادہ نقدی رہتی تو دوسرے روز صفائی ہو جاتی۔ یہاں تک کہ یار لوگوں نے صابن اور ٹوتھ پیسٹ پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر میرے خطوط سے کسی کو کیا سروکار؟ ہوسٹل میں مختلف عادات و اطوار کے

لڑکے رہتے تھے۔ کوئی محبت نامہ ہوتا تو سمجھتا کہ لڑکوں نے ازراہ شرارت کی بنا پر یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔

دروازے میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا۔ جو اس مقصد سے بنایا گیا تھا کہ وقت ضرورت خط وغیرہ ڈالنے کیلئے استعمال کیا جائے۔ بہر حال جب خط اس میں ڈالا جاتا ہے تو اسے اندر کمرے میں فرش پر پڑا ہونا چاہیئے تھا۔

دو ہفتے قبل میں نے گھر پیسے کیلئے لکھا تھا۔ انہی دنوں ٹیلیگرام منی آرڈر آنا چاہیئے تھا۔ جس کی اطلاع بذریعہ خط ملنی تھی۔ مگر نہ کوئی خط ملا اور نہ کوئی منی آرڈر۔ جب خالی ہو تو دنیا کی ساری رعنائی پھیکی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین واثق تھا کہ گھر کے لوگ پیسے بھیجنے میں کوتاہی نہیں کرینگے کم از کم انہیں اتنا تو معلوم تھا کہ میں دیار غیر میں پڑا ہوں جہاں پیسے کی کمی لازمی ہے۔

دوشیزۂ شب سرمئی شام پر اپنا آنچل ڈال رہی تھی ٹک شاپ میں ریڈیو گلا پھاڑ رہا تھا۔ لڑکے اپنی اپنی میزوں پر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں کونے کی میز پر اکیلا بیٹھا گانے سے جی بہلا رہا تھا۔

یعقوب ناسک اور دوسرے لڑکے میری میز پر آگئے۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا۔

یار، تم کچھ اداس نظر آرہے ہو؟" پرویز نے کہا۔

"الوّ بھی اداس رہتا ہے۔" یعقوب نے ریمارک پاس کیا۔ اسے میں نے اس کی قد و قامت کی بنا پر "پہلوانِ سخن" کا خطاب دے رکھا تھا۔ یہ صاحب مزاح نگار بھی تھے۔

"توبہ توبہ۔ کس منحوس پرندہ کا نام لیا۔" پرویز بھی اس چھیڑ چھاڑ میں شامل تھا۔

"الوّ بہت ہی انسان دوست پرندہ ہے۔"

"وہ کیسے ؟" پہلوان سخن نے اپنے دیدے نچائے۔

"اس لئے کہ الوّ ویرانے کو آباد کرتا ہے۔" پرویز کا جواب تھا۔

"خیر چھوڑو، ان باتوں کو۔" اب وہ مجھ سے مخاطب ہوا، پہلے تو میرے سراپا کا جائزہ لیا پھر بولا "یار۔ اگر تمہیں کوئی سیاح دیکھ لے تو سمجھے گا کہ پاکستان میں قحط پڑ گیا ہے۔"

اور تمہیں دیکھ کر اس کی وجہ بھی جان لیں گے۔" میں نے برنارڈ شا کا جملہ دہرایا۔ اور وہ لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ اس نے میرے لاغر جسم کو دیکھ کر چوٹ کی تھی۔ اسے اپنے موٹاپے پر بڑا ناز تھا۔ "آخر تھا پہلوانوں کے شہر گوجرانوالہ کا رہنے والا۔ جب چلتا تو ایسا لگتا کہ چڑیا خانے کا "شہ زور" جھومتا ہوا جا رہا ہے۔ ہم سے نوک جھونک جاری تھی کہ چند دوسرے دوست ان سے ملنے آدھمکے۔ ان لوگوں کو آپس میں مصروف گفتگو دیکھ کر میں کھسک گیا۔

اچانک کاریڈور میں چپراسی سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے دیکھتے ہی بول پڑا۔

"غالباً اب آپ کو خطوط کی شکایت نہیں ہوگی!"

"وہ کیسے؟" میں متحیر ہوا۔

"کل ہی میں نے ایک خط آپ کے کمرے میں ڈراپ کیا تھا۔"

"مگر وہ خط مجھ تک نہیں پہنچا۔" میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کمال ہے۔" اس نے حیرانی سے کہا "میں نے اچھی طرح جانچ پڑتال کے بعد خط آپ کے کمرے میں ڈالا تھا۔ کیونکہ مجھے آپ کی پریشانی یاد تھی۔"

کمرے کے آس پاس تم نے کسی کو چکر لگاتے تو نہیں دیکھا تھا۔"

میرے دل میں شک و شبہات نے سر ابھارا۔

"ہاں، ایک صاحب تو تھے ....." اس نے ذہن پر زور دیا۔

"ہاں ہاں۔ کہو نا، کون تھا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

وہ موٹا سا آپ کا دوست چکر لگا رہا تھا، ..... بھلا سا نام ہے ان کا ......"

"کہیں وہ یعقوب ناسک تو نہیں تھا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا

ہاں ہاں، اب یاد آیا، وہی تھے۔"

اب اس کے تمام حرکات میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

اچانک میرے دل میں خیال آیا۔ کہیں یہ اسی کی شرارت تو نہیں ؟ میں ان خیالوں میں الجھتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ آخر تھک ہار کر میں نے تہیہ کر لیا کہ اس بات کا ضرور پتہ چلاؤں گا کہ میرے خطوط کا کیا حشر ہوتا ہے ؟

ڈاک روزانہ شام کو آتی تھی۔ میں نے خود اپنے نام سے خط لکھ کر ڈاک کے حوالے کیا صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا وہ خط مجھے ملتا بھی ہے یا نہیں ؟

چنانچہ دوسرے روز جبکہ شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ میں کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے پر ہنوز تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے یہ ترکیب اس لئے آزمائی تھی کہ کسی کو بھی کمرے میں میری موجودگی کا علم نہ ہو۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ میں نے چپراسی کے پیروں کی چاپ سنی۔ اور دروازے کے شگاف سے ایک، دو، تین خطوط فرش پر گرے۔ میں نے انہیں جوں کا توں چھوڑ دیا۔ صرف یہ دیکھنے کیلئے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ گھنٹہ گذر گیا۔ انتظار کی مدت طویل ہوتی جا رہی تھی۔ میں پہلو بدل رہا تھا۔ کمرے میں خاصہ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس وقت تک میری آنکھیں اندھیرے میں تمام چیزیں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔

اچانک دروازے کے قریب ہلکی سی آواز ہوئی۔ تب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ جہاں کہ خطوط پڑے ہوئے تھے پہلے وہ ایک خط اٹھا کر لے گیا۔ پھر دوسرا، اس کے بعد تیسرا بھی ـــ

یہی وہ چور تھا جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کون تھا؟ ـــ ایک چوہا!

اس کا بل چوکھٹ کے اندر اندر دیوار سے ملا ہوا تھا۔ جب میں نے پلاسٹر ادھیڑا۔ تو وہاں اخبار کی کترن کے ساتھ میرے تمام خطوط کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔

خونِ رِستا ہے

جب میں باتھ روم سے غسل کر کے نکلا تو گیلا تولیہ گردن پر پڑا ہوا تھا۔ تولیے سے کانوں کو صاف کرتا ہوا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور تولئے سے سر کے بھیگے بالوں کو خشک کرنے لگا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ آسمان کی نیلاہٹ اور ہلکی دھوپ اس وقت بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ نسیم صبح سبک خرامی سے چل رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ لیکن میرا دل اداس تھا۔

میری نظر سامنے والی کوٹھی کی طرف اٹھ گئی۔ جس میں اب چند انگریز آکر بس گئے تھے۔ اور اپنے بچوں کو لیکر لان میں ٹہل رہے تھے۔ مگر اب مجھے اس کوٹھی سے کچھ دلچسپی نہ رہی تھی۔ صرف سابق مکینوں سے میرا ماضی وابستہ تھا۔ ماضی کی تلخ یادوں سے میرا ذہن جھنجھنا اٹھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں وہاں سے ہٹ آیا اور کنگھا لیکر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جب آئینے میں اپنے عکس پر نظر پڑی تو میرے لبوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ جھلک کر ماند پڑ گئی۔ مجھے اپنی ہی بے ترتیبی پر ہنسی آ رہی تھی ـــ میں بہت بے پرواہ ہو گیا تھا۔ میرے الجھے ہوئے

بال جو تیل سے بے نیاز تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ پژمردہ آنکھیں اور لبوں پر پھیکا تبسم! جو میری حالت پر ہنس رہا تھا۔ مجھ میں پہلے سے کافی تبدیلی آگئی تھی۔ مجھ پر بے انتہا مظالم ڈھائے گئے، مجھے دکھ درد، ٹھوکر اور غم سب ہی کچھ ملا۔ سچی خوشی اور راحت کبھی میسر نہ ہوئی۔ دنیا والوں نے مجھ پر طنز کیا اور میں اسے تلخ گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ قسمت نے مجھے لوٹا۔ مجھ پر قہقہے لگائے گئے۔ مجھ سے محبت بھی کی گئی۔ اور نفرت بھی۔ یہاں تک کہ میری ہر آرزو نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ میری روح سسکنے لگی۔ مگر اب ظلم و ستم نہ سہہ سکوں گا۔ کیونکہ میرا ناسور پھٹ چکا ہے۔

جمالو ٹرے میں ناشتہ لئے آپہنچا۔ میں صوفے پر بیٹھ کر دھوئیں کے مرغولے کو چھت کی طرف چھوڑ دیا۔ "ناشتہ میز پر رکھ دو جمالو۔"

"کہاں رکھوں صاحب؟" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

میں جھینپ گیا۔ کیونکہ میز پر کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا میں نے ان سبھوں کو دوسرے صوفے پر ڈال دیا۔ جمالو نے میز پر ناشتہ چن دیا اور خالی ٹرے لیکر چلا گیا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ توسٹ اور انڈا کھانے کے بعد چائے کی کپ اٹھالی۔ کپ سے چائے کی بھینی بھینی خوشبو بھاپ کے ساتھ اٹھ رہی تھی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے یہ بھاپ میرے ہی زخم خوردہ دل سے نکل رہا ہے۔ لہراتی اور بل کھاتی ہوئی بھاپ کی لکیروں میں مجھے میرا ماضی نظر آرہا تھا۔

گذرتے ہوئے واقعات سینما کے متحرک تصویروں کی طرح یکے بعد دیگرے
نظروں کے سامنے آنے لگے۔

اس دن جیسے ہوا کا نام ونشان تک نہ تھا۔ جون کا مہینہ تھا
بارش ہوئے تین چار دن ہو چکے تھے۔ دھوپ کی بے پناہ حدت کی وجہ سے
دن میں باہر نکلنا مشکل ہوتا اور رات کے وقت گرمی سے طبیعت پریشان
ہو جاتی۔ اس دن بھی رات میں غیر معمولی گرمی تھی۔ کپڑوں سے خارج
ہونے والی پسینے کی بدبو سے دل گھبرا جاتا۔ بدن گرمی سے جل رہا تھا۔ ٹیبل
لیمپ کی روشنی میں لکھنے بیٹھ گیا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ تھوڑی
دیر بعد خوشگوار ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آنے لگے۔ اور دل کو ایک قسم کی فرحت
بخشنے لگی۔ میرا لکھنا اسی ہوا کے سہارے چلنے لگا۔ بدن پسینے سے تر ہو گیا
تھا گرمی برداشت سے باہر تھی۔ مگر کبھی کبھی کھڑکی سے گذر کر آنے والی
خنک ہوائیں دل کو فرحت بخش دیا کرتیں۔ میں لکھتا جا رہا تھا۔ لکھتے
لکھتے نہ معلوم کتنی رات گذر گئی۔ جب ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی کی طرف
میری نظر اٹھی تو دیکھا کہ بارہ بج چکے تھے۔ سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا۔
تاریکی اور خاموشی کی چادر اوڑھے سارا شہر نیند کی گود میں خراٹے لے رہا تھا
وائلن کے تاروں کے انبساط آگیں ارتعاش نے مجھے چونکا دیا۔ میری نگاہیں
کھڑکی سے ہوتی ہوئی سامنے کوٹھی پر جا پڑی۔ رات کے بیکراں سکوت میں
ایک سایہ وائلن سے مسحور کن دھن نکال رہا تھا۔ جس میں پھولوں کی مہک

کا سرور تھا۔ چاند کی ٹھنڈک اور دل کی آواز تھی۔ اس کی لے نے خاموش چاندنی کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سبک خرام ہواؤں کو مسکرانے پر مجبور کیا تھا۔ اچانک ہواؤں کا ایک جھونکا آیا اور سایہ کا کاکل پیچاں لہرانے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو روزانہ صبح کے وقت معلوم نہیں کہاں جاتی ہے اور پھر گھنٹہ آدھ گھنٹے بعد واپس آجاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ وائلن رہتا۔

آہستہ آہستہ وائلن کی آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے کوئی چاندی کی پیالی میں شہد گھول رہا ہو۔ اس مدھر لے میں کھو کر نہ جانے کب میری آنکھ کھل گئی۔ میں اسوقت جاگا جب میرے کانوں میں چڑیوں کے چہچہانے کی آواز آئی۔ مشرق کی طرف آسمان پر سورج کا لال سا گولہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور میز پر افسانے کے بکھرے ہوئے اوراق کو قرینے سے سجانے لگا۔ جمالو نے آکر اطلاع دی کہ غسل کا پانی تیار ہے۔ جب غسل کر کے نکلا تو جمالو ناشتہ لئے کھڑا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالی۔ اور اپنے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے سلگایا۔ پھر کھڑکی میں کھڑا ہو کر باہر کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں نے دور ہی سے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں وائلن لئے خراماں خراماں چلی آرہی تھی۔ اس کا سڈول اور رعنا پھوٹتی ہوئی جوانی سے سرشار تھا۔ اس نے سرخ ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کا بلاؤز بھی

سرخ تھا۔ ہوا کے گستاخ جھونکے اسکے گھنگھریالے بالوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ وہ اپنے بالوں کو درست کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اس کی چال میں بلا کی قیامت تھی۔ وہ گیٹ پر ایک لمحہ کو رکی اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی چند ہچکچاہٹ کے بعد خلاف توقع مجھے اشارے سے بلانے لگی۔ میں بوکھلاہٹ میں کھڑکی سے ہٹ آیا۔ یہ غیر معمولی بات آج کیونکر ہوگئی۔ اسکے اس طرح اشارہ کرنے سے کیا مطلب تھا۔ مجھے اس بات کی کرید سی لگ گئی۔

میں دوبارہ کھڑکی کے پاس آیا تو وہ جا چکی تھی۔ چنانچہ میں نے فون کے ذریعہ بات کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کی کوٹھی کے نیم پلیٹ (NAME PLATE) پڑھکر ٹیلیفون ڈائری میں اس کا نمبر تلاش کر کے اسے رنگ کیا۔ ریسیو کرنے والی وہی تھی۔

"کون صاحب ہے؟" اس کی آواز کی کھنک، جیسے دور کسی حسینہ نے بربط کے تار چھیڑ دیئے ہوں۔

"جی، میں آپ کی کوٹھی کے سامنے والی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔"

"اوہ۔ تو آپ ہیں۔" اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوسری طرف اس کے گالوں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی ہو۔

"ابھی ابھی آپ مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھیں، آخر بات کیا ہے؟"

"ذرا ٹھہریئے۔" اُدھر کچھ دیر خاموشی رہی پھر آواز آئی۔

میرے والد صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیجئے ان سے گفتگو کیجئے۔"

اس نے یہ کہہ کر ریسیور اپنے والد صاحب کو دیدیا۔ ایک بھاری آواز آئی :۔ "ہیلو ! کیا شکیب جمالی بول رہے ہیں ؟"

جی ہاں، جی ہاں ۔"

"شکیب صاحب، آپ کے والد کیا کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں؟"

"جی وہ دورے پر گئے ہوئے ہیں اور آج کل ہی میں آجائیں گے۔"

"میں اور آپ کے والد بڑے اچھے دوست ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے یہاں آجائیں۔"

"جی اچھا۔ ابھی حاضر ہوا۔"

کریڈل پر ریسیور رکھ کر میں لباس تبدیل کرنے لگا۔ پھر جلدی جلدی زینے طے کر کے کمپانڈ میں داخل ہوا۔ وہی لڑکی پورچ میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ ڈرائنگ روم میں ایک شخص گاؤن پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پائپ تھا۔ جس میں سے دھواں نکل نکل کر فضا میں مدغم ہو رہا تھا۔ اس کے بال کچھ کچھ سفید ہو چکے تھے۔ غالباً وہی اس کے والد تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے ملے۔

"بیٹھو بیٹھو۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

" شاہین کئی دن سے تنگ کر رہی تھی کہ آپ سے ملا جائے۔ آپ کے افسانے پڑھا کرتی ہے۔ کسی سے سن لیا کہ آپ ہی وہ شکیب جمالی ہیں جو افسانے لکھا کرتے ہیں۔" بس پھر کیا تھا۔ میری ناک میں دم کہ آپ سے تعارف کرایا جائے۔"

میں نے صوفے پر بیٹھی ہوئی شاہین پر نگاہ ڈالی۔ اسکی شرم سے بوجھل پلکیں میری طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ اس کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

" اچھا بھئی۔ تم دونوں گفتگو کرو۔ میں بزنس کے سلسلے میں ایک صاحب کو فون کر کے ابھی آیا۔" شاہین کے والد یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر چلے گئے۔

" اچھا تو آپ میرے افسانے پڑھا کرتی تھیں۔ اس لئے مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔"

" میں ایک بات پوچھنا چاہتی تھی۔" وہ آنکھیں جھپکتی ہوئی بولی۔ آپ کے ہر افسانے کا انجام ٹریجڈی پر کیوں ہوتا ہے؟ کیا سارے جہاں کا درد بس آپ ہی کے جگر میں ہے۔" اسکی آنکھوں سے شوخی ظاہر ہو رہی تھی۔

اس لئے۔ کہ میں ہمیشہ ٹریجڈی سے دوچار رہتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پتہ نہیں آپ کو دنیا میں تجربات نے کیا کیا سکھایا ہے؟ میں اکثر سنتی آئی ہوں کہ کسی بھی فنکار کو اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

بیشک ہر فنکار کو مختلف قسم کی تکلیف دہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ دور میں ادیبوں کیساتھ بڑا ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔

میری بات ابھی جاری تھی کہ شاہین کے والد اندر داخل ہوئے ان کے پیچھے ایک بیرا ہاتھوں میں ناشتہ کی ٹرے لئے ہوئے تھا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھدی۔ شاہین چائے بنانے لگی۔ پھر اس کے والد نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

بھئی پرسوں شاہین بٹیا کی سالگرہ ہے اور تمہیں خاص طور سے مدعو کر رہا ہوں۔ دیکھو آنا مت بھولنا۔

میں نے چائے ختم کی اور سالگرہ پر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

شام کی گلابی شفق پھیل رہی تھی۔ شاہین کا گھر نئی نویلی دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ رنگ برنگ بلبوں کی لڑیاں قوس و قزح کی طرح بھلی لگ رہی تھیں۔ لال پیلی اور ہری جھنڈیاں ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ ہر طرف مہمانوں کی ریل پیل تھی۔ دروازے پر شاہین نے میرا استقبال مسکراتے ہوئے کیا۔ تحفے کا پیکٹ میں نے اس کے ہاتھوں

بین تھما دیا۔ اس نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ مسکراتی ہوئی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ بیرہ کچھ مٹھائی اور شربت کے دو گلاس ہمارے سامنے رکھکر چلا گیا۔ ہم دونوں مٹھائی کھانے کے بعد شربت سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ شاہین کے والد اندر داخل ہوئے اور مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولے۔

بھئی شکیب خدا جانتا ہے کہ تمہارے آنے سے بڑی خوشی ہوئی پھر شاہین کیطرف متوجہ ہوئے "چلو نا بیٹی! مہمان تمہاری موسیقی سننے کے منتظر ہیں۔

اس نے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور اٹھ کر چلی گئی "چلئے نا آپ بھی" اسکے والد مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے بولے۔

جب وہ وائلن لے کر ہال میں پہنچی تو سب کی نظریں اسکے حسین چہرے پر گڑ سی گئیں۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا اور جب اس نے کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر وائلن کے تار چھیڑے تو سننے والے اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ بعض سر دھننے لگے۔ سننے والے اپنی سدھ بدھ کھو کر ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔ سبھوں کی نظریں شاہین پر لگی ہوئی تھیں۔ وائلن بجاتے ہوئے اس کا چہرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گلدان میں رکھا ہوا گلاب کا پھول مسکرا رہا تھا۔ جب وائلن کی غیر فانی دھن ختم ہوئی تو سامعین نے تالیوں کی پرشور آواز میں شاہین کو داد دی۔ اور میں نے اس کی

تعریف میں صرف اتنا کہا۔

آپ کے وائلین کی دھن میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئی۔"

"شکریہ!" اس کے متبسم ہونٹ پھڑپھڑائے اور گالوں کی سرخی دوہری ہو گئی۔

ہلکی پر کیف چاندنی کائنات پر اپنی خواب آور چادر پھیلا رہی تھی۔ گہرے نیلگوں آسمان پر پھیلے سفید سفید ٹکڑوں کے درمیان چندا آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ہوا مست خرامی سے چل رہی تھی۔ ہم دونوں فلم دیکھ کر لوٹ رہے تھے۔ پہلے روز کی ملاقات کے بعد سے کم از کم ہر روز ہماری ملاقات ہونے لگی تھی۔ کبھی وہ میرے یہاں آجاتی کبھی میں اسکے یہاں چلا جاتا۔

سڑک کی کھلی اور سرد ہوانے شاہین کے تراشیدہ بال اسکے شانے پر بکھیر دیئے اور خوشبو کی تیز بھبک میرے نتھنوں سے ہوتی ہوئی دماغ کو معطر کرنے لگی۔ کولتار کی لمبی، سیاہ اور بل کھاتی ہوئی سڑک جیسے سانس روکے ہوئے لیٹی تھی۔

"آج موسم کتنا خوشگوار ہے"۔ اس نے آسمان پر آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔

"ہوں" کہہ کر میں دیکھی فلم کا گانا گنگنانے لگا۔

"کتنا حسین ہے موسم کتنا حسیں سفر ہے"۔

اسنے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے آج بڑے موڈ میں نظر آرہے ہو؟"

"اس لئے کہ ایک حسین ہمسفر ساتھ ہے۔ جس کے حسن سے شرما کر چاند بھی اپنا منھ بادلوں میں چھپا رہا ہے۔ موسم گنگنانے مجبور ہے اور..."

"بس بس رہنے دیجئے۔ باتیں بنانا خوب آتی ہیں۔"

بس۔ یہی باتیں ہی تو ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہارا حسن ہی چاہ رہا ہے۔ ع کوچۂ حسن کے ذرے یہ صدا دیتے ہیں

ضد پہ ہم آئیں تو تاروں کو بجھا دیتے ہیں

اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ کوٹھی کے پھاٹک پر رک کر میں نے اسے شب بخیر کہا۔ سگریٹ کا آخری کش لگا کر بچے کھچے ٹکڑے کو جوتے سے مسل دیا اور گھر واپس آگیا۔

لکھتے لکھتے میں نے ہاتھ روک لیا اور سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لگائے۔ سگریٹ کا پیچ و تاب کھاتا ہوا دودھیا دھواں ابھی فضا میں اچھی طرح تحلیل بھی نہیں ہوا تھا کہ شاہین آگئی۔ اسکی مسحور کار آنکھوں کے گرد تفکرات اور غم والم کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ گھنی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے۔

"کیا بات ہے شاہین؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"شکیب۔" اس کی آواز شدت غم سے لرزنے لگی۔ "ڈیڈی میری شادی کر رہے ہیں۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کس سے؟"

"مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے۔ صرف اتنا پتہ چل سکا کہ ڈیڈی اسکے والد کے دوست ہیں۔ آج سے پندرہ روز بعد میری شادی ہے جائے گی۔" مگر میں زہر کھالوں گی۔ مرجاؤں گی۔ کسی دوسرے کی نہ بنوا گی۔"

ہشت۔ پاگل ہوئی ہو کیا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، تمہاری ہی بھلائی کیلئے۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بھلائی۔ ہونہہ۔ اگر انہیں اتنا ہی خیال تھا تو میری پسند ضرور پوچھتے۔" وہ جیسے بپھر گئی۔

"تم یوں روتی کیوں ہو۔ شادی میں ابھی پندرہ دن باقی ہیں اس عرصے میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ آج کل میں اباجان آنے والے ہیں۔ میں ان کے ذریعہ شادی کا پیغام بھجواؤں گا۔ اور مجھے یقین واثق ہے کہ تمہارے اباجان انکار نہ کریں گے۔" میں نے انکے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

"یہ کہیں خیال خام نہ ہو اور اسی انتظار میں کسی اور کی نہ ہو جاؤں" اس کی آنکھوں سے رم جھم برسنے لگا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ میری آنکھیں بھی بے بھیگ گئیں۔ دل میں آنے والے اندیشہ کے تحت ہوک اٹھی۔ دھڑکتے دل سے اسے تسلی دی اور گھر چھوڑ آیا۔

میں صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ کھٹ کی آواز سنکر پیچھے دیکھا۔ اباجان کھڑے مسکرا رہے تھے۔

آپ نے بڑی دیر لگادی اباجان" میں ان سے لپٹ گیا۔

"کام بھی تو کچھ ایسا ہی تھا۔" انہوں نے کہا۔ "پھر اسی دوران میں، میں چپکے چپکے تمہارے سر پر سہرا باندھنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔"

"جی۔" میں نے حیرت سے کہا۔

ارے بھئی۔ سامنے والی کوٹھی میں میرے بچپن کے دوست رہتے ہیں۔ ان کی لڑکی شاہین سے تمہاری شادی کی بات طے کر دی ہے وہ بہت ہی سلیقہ مند لڑکی ہے۔ امید ہے کہ میری پسند سے تمہیں اختلاف نہ ہوگا۔"

مجھے اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ تو گویا شاہین کے ڈیڈی میری ہی شادی کی بات خط و کتابت سے طے کر رہے تھے۔ اگر شاہین کو یہ بات معلوم ہو جائے تو پھر؟ شاید وہ شرما کر گھٹنوں میں سر چھپا لے گی۔ یہ سوچ کر خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

"تم نے کچھ جواب نہیں دیا بیٹا۔"

"جی۔ بھلا مجھے کیا اختلاف ہو سکتا ہے۔" میں نے سر جھکائے جواب دیا۔ یہ سن کر انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور شادی کے انتظام میں لگ گئے۔

شادی بڑے دھوم دھام سے ہو گئی۔ مجھے شاہین کیا ملی زندگی مل گئی۔

میں نے اس کے آنچل تلے زندگی کی نئی صبح دیکھی۔ اس کے نقرئی لب پر ہزار ہا تبسم رقصاں تھے۔ جس کے سنہرے سپنے کی مست لے میں من جھولا جھول رہا تھا۔ مگر ایک دن ایسا حادثہ ظہور پذیر ہوا۔ جس سے ستارے کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ آسمان رو دیا۔ دھرتی کا کلیجہ دہل گیا۔

شاہین زینے سے اتر رہی تھی کہ اس کا پاؤں زینے پھسل گیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی نیچے آرہی۔ اس کا سر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ جلدی جلدی ڈاکٹر بلایا گیا۔ انجکشن لگنے کے بعد ہوش میں آتے ہی اس نے مجھے پکارا۔ میں اس کے قریب گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے شاہین؟"

آپ کہاں ہیں؟ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔" وہ چیخ پڑی۔ میری آنکھیں۔ کیا ہوگیا ان کو؟" میرا دماغ جیسے ماؤف ہوگیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کیا شاہین اندھی ہوگئی۔ اُف یہ کیا ہوگیا؟؟

ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کا معائنہ اور مجھے کنارے لیجا کر کہا۔

"مسٹر شکیب! آئی ایم ویری ساری، زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپ کی بیوی کی آنکھیں جاتی رہی ہیں۔" یہ سن کر میری چیخ حلق میں پھنس گئی۔ دل تڑپ کر رہ گیا۔ آخر میں تقدیر کے آگے کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس کے لئے کئی جتن کئے مگر سب بے کار۔

میں نے اسے شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ مگر کوئی بھی اس کی آنکھوں کی جوت واپس نہ لا سکا۔ وہ ہر وقت گم سم پڑی رہتی۔ نہ ہنستی نہ بولتی بس سوچتی چلی جاتی۔ میں جب اسے ٹوکتا تو الٹے مجھ سے سوال کرنے لگتی۔

"کیا میری آنکھیں دوبارہ اچھی نہ ہو سکیں گی، کیا میں ہمیشہ کی اندھی ہو جاؤں گی"

اور میں اسے دلاسا دینے لگتا "گھبراؤ نہیں شاہین! خدا نے چاہا تو تمہاری آنکھوں کی جوت لوٹ آئیگی"

وہ خلا میں یاس و امید کی کرن ڈھونڈنے لگتی۔ اس کے مغموم حسن سے کچھ ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے کوئی مرجھایا ہوا پھول موسم بہار کی آس لگائے ہوئے ہو۔ اسے کلکتہ کے میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا جہاں اس کی آنکھوں کا آپریشن بھی ہوا۔ مگر نوشتہ تقدیر! اسکی آنکھوں کی روشنی لوٹ نہ سکی۔ چار و ناچار اسے گھر لے آیا۔ وہ ہر وقت غمگین رہتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے لاتعداد قطرے پھول سے نازک رخساروں پر بہتے ہوئے کائنات کی لامحدود وسعتوں میں مدغم ہو جاتے۔ اسے روتا دیکھکر میں تڑپ جاتا۔ دل مسوس کر رہ جاتا۔ خدا سے فریاد کرتا مگر سب بیکار۔ اسکی آنکھوں کی جوت لوٹ کر نہ آنی تھی نہ آئی۔

ایک دن میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک افسانہ لکھ رہا تھا وہ ٹٹولتے ٹٹولتے میرے پاس آئی، اور بولی "کیا کر رہے ہیں؟"

"افسانہ لکھ رہا ہوں"

ایک خوش خبری سنئے گا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا جس میں

خرم وحیا بھی جاگزیں تھا۔

"" اوہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ میں نے پیار سے اسکے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اس نے لجاتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ جسے سنتے ہی میں خوشی سے دیوانہ ہوگیا اور اسے گود میں اٹھاکر پورے کمرے میں ناچنے لگا

گھر میں نئے مہمان کی آؤ بھگت کیلئے پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگیں۔ دن گذرتے گئے۔ مہینے گذرتے گئے آخر وہ دن بھی آگیا۔۔۔۔ ڈیلیوری کا دن۔ سارا دن میں نے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے معلوم نہیں کتنے سگریٹ پھونک ڈالے۔ کبھی اٹھ کر یونہی ٹہلنے لگتا۔ کبھی غیر ارادی طور پر کرسی میں دھنس جاتا۔ میرے کان نرس کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ جو کچھ دیر بعد آکر زچہ کی خیریت کی خبر دے جاتی۔ ابا جان اور شاہین کے ڈیڈی بھی پریشان تھے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب لیڈی ڈاکٹر بیحد گھبرائی ہوئی باہر آئی اور شہر کے بہترین ڈاکٹر مسٹر گھوش کو فون کرنے کو کہہ گئی۔

میرے فون کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر گھوش آپہنچے۔ لیڈی ڈاکٹر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ آدھ گھنٹہ بعد جب وہ نکلے تو ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ میرے قریب آکر ہمدردی سے بولے "مسٹر شکیب مجھے بے حد افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہ کرسکا۔۔۔۔ بھگوان کی اچھا" شاہین چل بسی مجھ کو چھوڑ کر۔ یا خدایہ تو نے کیا کیا؟ کیا تو نے

مجھے اس دنیا میں دکھ درد ہی سہنے کیلئے رکھ چھوڑا ہے۔ میرے پیار کا سوتا سوکھ گیا۔ وہ شمع بجھ گئی جس سے گھر کی رونق تھی۔ ستارہ ٹوٹ گیا، پھول ٹوٹ کر خاک بوس ہو گیا۔ میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ایسے زبردست طوفان غم کا مقابلہ بھلا کون کر سکتا ہے؟

میں اپنے انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اور نہ معلوم کب تک کھویا رہتا اگر چائے کی پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹ پڑتی۔ جمالو بھاگتا ہوا اندر آیا۔

"کیا ہوا صاپ؟" اس نے انگوچھا کندھے پر سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ کپ ٹوٹ گئی ہے۔" میں یہ کہہ کر کپ کے ٹکڑوں کو اٹھانے لگا تھا کہ ایک تیز کرچ انگلی میں چبھ گئی۔ اور سرخ سرخ خون رسنے لگا۔ جمالو نے میرے زخم پر پٹی باندھنا چاہی۔ مگر میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ زخم سے خون رس رس کر انہیں ٹکڑوں پر پھیلنے لگا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے زخم کھل گئے ہوں اور اسے بند کرنا میرے بس کی بات نہ رہی ہو۔ شاید یہ خون یونہی رستا رہے؟

جرمانہ

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ میں بارہ برس کا تھا۔ ایک دن میں اپنے چچا کے ساتھ کلکتہ جارہا تھا۔ ہم لوگ اسٹیشن پہنچے۔ اور ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوگئے۔ ٹرین کے آنے میں تین چار منٹ دیر تھی۔

پلیٹ فارم پر کافی بھیڑ تھی۔ قلیوں اور خوانچہ والوں کی چیخ و پکار کسی بھنڈی بازار کا منظر پیش کررہی تھی۔ مسافر قلیوں کے سروں پر سامان ڈالے ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہمارے قریب پانچ اپٹوڈیٹ قسم کے آدمی کھڑے آپس میں ہنسی مذاق کررہے تھے۔ ٹرین ٹھیک اپنے وقت پر چھک چھک کرتی، دھوئیں اڑاتی پلیٹ فارم پر آکر ٹھہر گئی۔ ہم لوگ سکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں جاکر بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ ہی وہ پانچوں آدمی بھی اندر داخل ہوئے اور سامنے والے برتھ پر آرام سے بیٹھ گئے۔ گارڈ نے جھنڈی دکھائی اور ٹرین ایک تیز سیٹی کے ساتھ چکنی پٹریوں پر دوڑنے لگی۔ چونکہ آئندہ اسٹیشن کلکتے کا تھا اس لئے گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔ کمپارٹمنٹ کے اندر ان پانچوں آدمیوں نے پھر ہنسی مذاق شروع کردیا۔

میں نے سنا ہے کہ زنجیر کھینچنے سے گاڑی رک جاتی ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"گاڑی تو کلکتہ اسٹیشن کے علاوہ کہیں بھی نہیں رکے گی۔"

دوسرے نے کہا۔

"تب تو زنجیر کھینچنا چاہیئے۔ مزہ آئے گا۔" تیسرا بولا۔

ہم زنجیر بلاوجہ کیسے کھینچیں۔ گارڈ نے اگر پکڑ لیا تو....؟

"تو.... تو کیا.. کیا کرنا چاہیئے؟" اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، ایک بات سنو۔"

"کیا۔"

تھوڑی دیر تک وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ پھر ایک نے کہا۔ "بھئی سب دس دس روپے دو۔" ایک نے سب سے دس دس روپے لے کر اپنے پاس جمع کر لئے۔ اور دوسرے نے آگے بڑھ کر زنجیر کھینچ دی۔ ٹرین کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ اور انجن نے زور کی سیٹی بجائی اور پھر یکایک گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ مسافروں میں کھلبلی مچ گئی۔ گاڑی کے اس سرے سے لیکر اس سرے تک آدمی کھڑکیوں سے سر نکالے وجہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ہمارے ڈبے میں آن پہنچا۔

"کس نے زنجیر کھینچی ہے۔" گارڈ نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ اور

ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان پانچوں آدمیوں نے چچا جان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" انہوں نے "

ہم عجب تذبذب کے عالم میں چپ تھے۔ کمپارٹمنٹ میں ہم لوگ اور ان پانچ آدمیوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ ہم جھوٹی الزام کی تردید کیلئے آخر کس کو پیش کرتے۔

" کیا زنجیر آپ نے کھینچی ہے ؟ گارڈ چچا جان سے مخاطب ہوا۔ پہلے تو چچا جان بہت گھبرائے۔ مگر پھر ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔" جی ہاں۔"

" آخر آپ نے زنجیر کس وجہ سے کھینچی " گارڈ نے پوچھا۔

" ان پانچوں نے ہمارے پچاس روپے چھین لئے ہیں۔" چچا جان نے ان پانچ آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

کیوں جی، تم لوگوں نے ان کا روپیہ کیوں چھینا ؟ گارڈ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اور پانچوں سٹپٹا گئے۔ گارڈ نے چچا جان سے پوچھا۔

" اگر ان کی تلاشی لی جائے تو آپ کے پچاس روپے ملیں گے ؟

" جی ہاں۔ روپے ضرور ملیں گے۔"

گارڈ کے ساتھ ریلوے کے دو کانسٹبل بھی تھے۔ انہوں نے پانچوں کی تلاشی لی تو ان میں سے ایک کے پاس پچاس روپے ملے۔ گارڈ نے وہ پچاس روپے چچا جان کے ...... اور ان پانچوں کو ریلوے پولس کے حوالے کر دیا۔

وہ لاکھ گڑ گڑائے۔ چلائے مگر ان کی سنتا کون تھا؟

گارڈ نے رخصت ہوتے وقت چچا جان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ آپ نے زنجیر کھینچ کر بہت اچھا کیا۔ ورنہ یہ بدمعاش آپ کے روپے لے کر بھاگ بھی سکتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد چچا جان اتنے زور سے ہنسے کہ پورا کمپارٹمنٹ گونج اٹھا۔ اور میں بھی قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ "چلو اچھا ہی ہوا! کلکتہ گھومنے کے پچاس روپے ہو گئے۔

اب بھی یہ واقعہ یاد آنے پر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایک شعلہ

ادیگا میں مشہور انگریزی فلم "قلوپطرہ" چل رہی تھی۔ فلم کا آٹھواں ہفتہ تھا۔ مگر رش میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں ٹکٹ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ میں کار سینما کے کمپاؤنڈ میں پارک کر کے بکنگ آفس کی طرف بڑھا مگر اتنی لمبی قطار لگی ہوئی تھی کہ ہمت جواب دے گئی۔ میں نے مایوسی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید کوئی حسین سہارا مل جائے اور اسے ڈھال بنا کر ٹکٹ حاصل کروں مگر میری یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ حسین سہاروں کے ذریعہ ٹکٹ حاصل کرنا اہل لاہور کا آخری حربہ ہوتا ہے۔

میں سینما ہال سے ناکام و نامراد لوٹنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک اَپ ٹو ڈیٹ جدید فیشن کی چلتی پھرتی قیامت کاؤنٹر کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ اور میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں وہ بکنگ آفس کی کھڑکی پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔ "اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میرے لئے بھی ایک ٹکٹ لے لیں"۔

امید تو نہ تھی کہ وہ میری درخواست قبول کرے گی۔ مگر خلاف توقع اس نے ایک اور ٹکٹ حاصل کر لیا اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے شکریہ ادا

کر کے ٹکٹ کے پیسے اسے دے دیئے۔

اس وقت تک اس قتالۂ عالم کو بغور دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مگر جس وقت وہ مجھے ٹکٹ دینے لگی تو اس کے حسن کی ضیاء پاشی سے میرے خرمن ہوش پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کا فراد کو دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے کسی یونانی سنگ تراش کے مجسمہ میں جان پڑ گئی ہو۔ وہ دنیائے حسن کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اسکے بنانے میں سخاوت کے دریا بہا دیئے ہوں۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کے حسن کی تعریف الفاظ سے نہیں کی جا سکتی۔ چند منٹ تک میں سینما کی لابی میں ٹہلتا رہا۔ پھر ہال کے اندر داخل ہوا مگر یہ دیکھکر چونک پڑا کہ میری سیٹ بھی اسی نو بر شکن حسینہ کے ساتھ تھی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی، اس کی زلف عنبریں کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ فلم شروع ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اسی اثناء میں پٹیٹو چپس والا سامنے سے گذرا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ اور دو پیکٹ چپس طلب کئے۔ ایک خود لیا اور دوسرا محترمہ کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ مگر میرے اصرار پر لے لیا۔ ہم چپس کھا رہے تھے کہ فلم شروع ہو گئی۔ میری نظروں کے سامنے سے تصویریں گذر رہی تھیں۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرا ذہن اس حور شمائل میں الجھا ہوا تھا کہ جسم سے بہت ہی سحر آگیں

خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ جو میرے جذبات میں ہلچل مچائے ہوئے تھی۔ پھر انٹرویل ہو گیا اور سارا ہال روشنی سے جگمگا اٹھا۔ میں خاموش ہی بیٹھا تھا کہ یک بیک وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "کہیئے پکچر کیسی لگ رہی ہے؟"

میں اس کے اس غیر متوقع سوال سے بوکھلا اٹھا۔ مجبوراً بات کاٹنے کے لئے چھینک کا سہارا لینا پڑا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے قدرے شرماتے ہوئے اپنا نام "نائلہ" بتایا۔ پھر ہم اپنے اپنے خیال میں کھو گئے۔ ہال میں تاریکی چھا جانے کے بعد پکچر شروع ہو چکی تھی۔ نادانستہ طور پر جب کبھی میری کہنی اسکے جسم سے ٹکرا جاتی تو میرے سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ میرا نفس تیز ہو جاتا اور میں بے خود سا ہو جاتا۔ میں ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں سے خود مجھے بھی اپنی خبر معلوم نہیں تھی۔ اس طرح پوری فلم ختم ہو گئی۔ ہال دوبارہ روشنی کے سیلاب میں نہا گیا۔ اور میں کھویا کھویا سا باہر آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی سٹپٹا گیا۔ کیونکہ بارش زور و شور سے ہو رہی تھی۔ عین اس وقت وہ شعلہ بھڑکتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

"ارے بارش ہونے لگی، اب تو جانے کیلئے رکشا بھی نہیں ملیگا"

وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔

"کہاں جائیے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ٹمپل روڈ۔ مگر اتنی رات کو رکشا....."

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری کار حاضر ہے، میں وہاں تک لفٹ دے سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے سمن آباد تک جانا ہے"۔ میں اسکی بات کاٹ کر کہا۔

"مجبوری ہے" اس نے اپنے کندھے اچکائے۔ آپکے ساتھ ہی جانا پڑیگا"

مجھے اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اور وہ بالکل میرے بغل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اب بارش تھم چکی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ جبکہ بغل میں جوان اور گداز جسم ہو جس کے انگ انگ سے جوانی کا نشہ پھوٹ رہا ہو وہاں بڑے سے بڑے زاہد کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ کار اب شادماں کالونی سے گذر رہی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ کبھی کبھار اکا دکا گاڑی اوورٹیک کر کے گذر جاتی۔ ہوا تیز تھی۔ جس کی وجہ سے بالوں کی ایک شوخ لٹ اس کی کشادہ پیشانی پر لہرا رہی تھی۔ مجھے اس لٹ کی خوش قسمتی پر رشک آ رہا تھا کہ اسے اس مہ وش کی قدر قربت حاصل تھی۔ اچانک اس کی اور میری نظریں ملیں اور میں دل ہی دل میں یہ شعر پڑھنے لگا

ہم نے دیکھی ہیں کسی شوخ کی مستی بھری آنکھیں
ملتی جلتی ہیں بہت چھلکے ہوئے پیمانے سے

میں ٹمپل روڈ جانے کیلئے مزنگ سے گاڑی موڑلی اچانک نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے اپنی مرمریں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں

اگر میں بریک نہ لگاتا تو اسٹرنگ پر میرا ہاتھ بہک جاتا۔ میں اپنے بازوؤں میں اسے بھینچ لیا اور اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کو چومنے لگا۔ اچانک اس نے اپنا ہاتھ میرے کوٹ کے اندر دنی جیب میں ڈال دیا۔ میں تڑپ کر اس سے ایسا الگ ہوا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اچانک اس کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"مسٹر، اگر خیریت چاہتے ہو تو اپنا بٹوا میرے حوالے کر دو۔"

"جی !" حیرت سے میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں۔ یہاں سے تھانہ بالکل قریب ہے۔ میری ایک چیخ آپ کو بڑے گھر کی سیر کرانے کیلئے کافی ہوگی۔" اس نے کسی شاطر عورت کے انداز میں کہا۔

اپنے آپ کو اغوا کے الزام میں پھنستے دیکھ کر میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔ مجھے اپنے جسم کا لہو منجمد ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس خوشگوار موسم میں بھی میں پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے میری جیب سے بٹوا نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا اور مجھے "ٹاٹا" کرتی ہوئی پر پیچ گلیوں میں غائب ہو گئی۔

آنسو

خلاف معمول آج میں ذرا سویرے اٹھ بیٹھا اور میز پر بکھری ہوئی کتابوں اور کاپیوں کو سجانے لگا۔ اچانک میرے کانوں نے سنا۔

"رینو۔ اٹھو.... اٹھو.... سویرا ہوگیا"۔ کوئی سن رسیدہ عورت کسی لڑکی کو جگا رہی تھی۔

"اوں.... اٹھتی ہوں"۔ کسی دوشیزہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی مترنم آواز سنائی دی۔

میری نگاہیں اس صدائے شیریں کی طرف مرکوز ہوگئیں۔ آواز پڑوس والے مکان سے آ رہی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور میں تکتا جا رہا تھا اس کافر جوانی کو! اس دیوی کو جو کہ جوش شباب میں انگڑائی پر انگڑائی لیتی جا رہی تھی۔ اور اپنی خمار آلود آنکھوں کو ملتی جا رہی تھی۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا اور اس کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا کہ وہ اٹھی اور منہ دھونے اندر چلی گئی مگر میری نگاہیں کھڑکی پر ہی جمی رہیں۔

کچھ دیر بعد وہ ایک نئے انداز سے کمرے میں داخل ہوئی اور جب وہ نازک اندام حسینہ ٹہلتی ہوئی کھڑکی کے نزدیک پہنچی تو نگاہیں چار ہو ہی گئیں۔

اور نہ جانے کس جذبے تحت میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ شرما کر اندر بھاگ گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ بجلی کدھر سے چمکی اور کدھر غائب ہوگئی۔

یہ ہمارے نئے پڑوسی کی لڑکی تھی۔ ساتھ والا مکان کل ہی آباد ہوا تھا اور پڑوسی ہونے کے ناطے امی ان کے گھر بھی ہو آئی تھیں۔ واپسی پر انہوں نے بتایا تھا کہ کسی آفس میں ملازم ہیں۔ میاں بیوی اور لڑکی سب کے سب ملنسار تھے۔

اسی شام امی نے نئے پڑوسی کو چائے کی دعوت دیدی۔ گھر کے تمام افراد آئے۔ ساتھ میں وہ بھی شرماتی، لجاتی آئی۔ چائے کی میز پر ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ حجاب سے اس کے گال قندھاری انار کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے پتاجی بڑے ہی زندہ دل انسان ثابت ہوئے۔ ان کا انداز گفتگو اتنا پیارا تھا کہ جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ انہوں نے منٹوں میں سبھوں کو اپنی باتوں کے سحر میں جکڑ لیا۔

دوران گفتگو اچانک انہوں نے والد صاحب سے میرے بارے میں پوچھا۔ "آپ کا برخوردار ان دنوں کیا کر رہا ہے؟"

"بی۔ اے فائنل میں پڑھتا ہے۔"

"بھئی۔ میں تو یہاں نیا نیا آیا ہوں۔ کل رینو کو داخلہ کے لئے کالج لے جانا ہے، اگر ساجد میاں ساتھ ہوتے تو اچھا تھا۔" انہوں نے اپنی موٹی عینک کے پیچھے گھورتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"بالکل بالکل۔" والد صاحب نے مجھ سے کہا "بیٹے۔ کل ان کے ساتھ ضرور جانا۔"

"جی ــــ بہت اچھا۔" میں نے حامی بھر لی۔

دوسرے دن میں، رینو اور اس کے پتاجی کالج گئے۔ پرنسپل سے ملنے کے بعد تھوڑی دیر میں داخلہ ہو گیا۔ وہ رینو کو میرے ساتھ چھوڑ کر دفتر چلے گئے ــــ

"آج تو آپ کو رول نمبر نہیں ملا۔ پھر کلاس کیسے کریں گی۔" میں نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ویسے کوئی بات نہیں۔ آپ بغیر رول نمبر بھی کلاس کر سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو آپ ہی فیصلہ کیجئے نا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ورنہ میں گھر چلی جاؤنگی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"محترمہ پڑھنا آپ کو ہے یا مجھے؟ فیصلہ بھی آپ کریں گی۔ میں ہمیشہ تو آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"جی ــ" اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ پھر شرما کر سر جھکا لیا۔

یہ شرم و حیا کی دیوی مجھے تمام لڑکیوں سے مختلف لگی۔ میں اسے اپنے ساتھ کیفے ٹیریا میں لے گیا۔ وہاں دنیا جہاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ اپنی سنائی کچھ اسکی

سنی۔ پہلی نظر میں، میں اسے بڑی شرمیلی اور کم گو سمجھا تھا۔ مگر جب باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پتہ چلا کہ اس کا مطالعہ اچھا خاصہ ہے اور سنجیدگی سے دنیا کے نشیب و فراز کے بارے میں بھی غور کیا ہے۔

اب ہم دونوں روزانہ اپنی اپنی کھڑکیوں پر بیٹھے سارے جہاں کی باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو پر اشتیاق نظروں سے دیکھا کرتے۔ دل دھڑکتے اور دھڑک دھڑک کر بے چین ہو جاتے! اس طرح دن گذرتے گئے اور ہم دونوں کی محبت پروان چڑھتی گئی۔

میری اپنی زندگی میں رینو کی کتنی وقعت تھی، کچھ میں ہی بہتر جانتا تھا۔ میرے لئے اس کا وجود باعثِ مسرّت تھا اور اس کی شوخ، چنچل اور بے باک باتوں میں ناقابلِ بیان لذت محسوس کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں نے اس کی آنکھوں میں حزن و ملال کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دیکھا۔ میرے لاکھ استفسار پر دل کی بات زبان پر لانے سے قاصر رہی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر کسی مصلحت کی بنا پر زبان نہیں کھولتی۔ اتنی سی بات کا میں نے کوئی خاص اثر نہ لیا۔ میرے روم روم میں رینو بس چکی تھی۔ اس سے ہٹ کر میں کچھ سوچنے کیلئے تیار نہ تھا۔

میرا روز روز کھڑکی پر بیٹھنا دوسروں کے دلوں میں شک پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ والد صاحب جو ذات پات اور مذہب کے معاملے میں کٹّر تھے۔ ہماری محبت ان کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکنے لگی۔ وہ عام بزرگوں

کی طرح ہمارے درمیان حائل ہو گئے۔ ہمارے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔ رینو ہندو تھی اور میں مسلمان۔

ایک دن والد صاحب کی غصہ بھری آواز آنگن میں سنائی دی۔

"ساجد کو برابر کھڑکی پر بیٹھا ہوا پاتا ہوں.... آخر بات کیا ہے؟"

"اسی سے پوچھئے۔" امی نے کہا۔

"میں جو پوچھتا ہوں، اس کا جواب دو۔" والد صاحب کی آواز میں گرج تھی۔

"میں کیا جانوں؟"

"کان کھول کر سن لو۔ آئندہ اسے کھڑکی کے قریب پایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" والد صاحب نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

میرا دماغ چکر کھانے لگا۔ والد صاحب کے غصے کئی بار دیکھ چکا تھا اس لئے اس دن سے کھڑکی کے پاس کھڑا ہونا بند ہو گیا۔

مجھ سے میری آنکھوں کا چین چھن گیا۔ میرا دل پاش پاش ہو گیا۔

"اب کیا ہوگا؟" یہی سوال میرے دماغ میں چکر لگانے لگا۔

ایک دن زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کمرے میں مغموم بیٹھا نارنگی کے چھلکے چھیل رہا تھا کہ اس نے کھڑکی کھول کر میری طرف دیکھا۔ وہاں میرے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ ایک دوسرے کی کھڑکیاں صرف دو تین گز کے فاصلے پر تھیں۔

"سنئے!" اس نے سریلی آواز میں پکارا۔

"جی۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا۔

"اِدھر آئیے۔"

دروازے سے باہر برآمدے کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد میں کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"ناراض ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"پھر مجھ سے اتنی بے رخی سے کیوں پیش آ رہے ہیں۔"

"کہیں والد صاحب نہ آجائیں۔" میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"آج سینما چلئے گا؟"

"یہ آج سینما کی کیا سوجھی؟"

"کچھ ضروری باتیں ہیں۔ وہیں بتاؤں گی؟"

"بہت اچھا..... مگر کس سینما میں؟"

"لبرٹی میں۔"

"وہاں تو فلم "آنسو" چل رہی ہے۔"

"ساجد!" اچانک والد صاحب کی آواز سنائی دی اور میرے تو ہوش اڑ گئے۔ رینو نے جھٹ کھڑکی بند کر لی۔

"وہاں کیا کر رہے تھے؟ والد صاحب نے پوچھا۔

کچھ بھی تو نہیں ابو! نارنگی کے چھلکے کھڑکی کے باہر پھینک رہا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی نارنگی انہیں دکھاتے ہوئے کہا اور انہوں نے یقین کر لیا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

رات میں ہم دونوں فلم دیکھنے کے بعد واپس لوٹ رہے تھے۔ نہ جانے وہ کس سوچ میں گم تھی۔

"ایک بات سنیئے گا ساجد بابو!" اس کی آواز سے جیسے میں چونک پڑا۔

"آپ مجھے بھول جانے کی کوشش کریں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔

"دراصل محبت کسی بندھن کا نام نہیں۔ تمام قیود اور رنگ و نسل سے آزاد ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کا مذہب ایک نہیں۔ میں ہندو اور آپ مسلمان ہیں۔ دنیا ہم دونوں کا ملاپ پسند نہیں کرے گی۔ نہ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتی ہوں نہ آپ۔ امید ہے کہ آپ مجھے بھولنے کی کوشش کریں گے۔" کہتے کہتے جیسے اس کا گلہ رندھ گیا۔

"مگر رینو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"رہنا پڑے گا۔ دنیا میں ہزاروں لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی زندگی کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ پھر محبت سے مایوس ہو کر زندگی سے منہ موڑنا بہادری نہیں۔"

"یہاں بہادری کا سوال پیدا نہیں ہوتا رینو - دل کی بات ہے۔ جذبات مجھے جلا جلا کر راکھ کر دے گی۔ تمہاری یاد ہمیشہ میرے دل کو ڈستی رہے گی۔ تمہارے بغیر میں کس کے سہارے جیئوں گا۔"

اس نے اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر میری انگلی میں پہنا دی جس میں ہیرے کا ننھا سا نگینہ جگمگا رہا تھا۔

یہ پہلا اور آخری تحفہ اس لئے دے رہی ہوں کہ جب کبھی انگوٹھی کو دیکھو تو مجھے یاد کر لینا۔" اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو موتی لرزنے لگے۔

ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ جدا ہونے سے پہلے میں نے اس کا حسین چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کیا اور اسے الوداعی بوسہ دیا۔

اس دن سے میں بیمار پڑ گیا۔ دو ہفتے گذر گئے لیکن بستر سے نہ اٹھ سکا۔ میری آنکھیں اسے دیکھنے کے لئے بے چین رہتیں۔ جب کبھی میری نظر پر پڑتی تو ایسا لگتا جیسے انگوٹھی کے سفید ہیرے کی جگہ رینو کا آنسو منجمد ہو گیا ہو۔

ایک دن سنا کہ اس کے پتاجی کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ اور وہ لوگ جانے والے ہیں۔ اس کے گھر کے تمام لوگ جا رہے تھے۔ اسے آخری بار دیکھنے کو دل مچل اٹھا۔

اچانک وہ میرے کمرے میں آن پہنچی۔ امیؔ میرے سرھانے

بیٹھی تھیں۔ ان سے ملی۔ پھر رخصت ہونے لگی۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ پر ایک آخری نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔

میں تڑپ اٹھا۔ پھر اسے کبھی نہ دیکھ سکا۔ اکثر اس کی یاد آنکھوں میں آنسو بن آجاتی ہے۔

روح

زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ پورا شہر جل تھل ہو گیا تھا۔ سیلاب نے تمام شہر پر ویرانی مسلط کر دی تھی۔ ہر طرف رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بجلی کی کڑک سے دل دہل رہا تھا۔ ہر طرف بھیانک خاموشی طاری تھی۔

ایک بوسیدہ جھونپڑی میں بیٹھی مفلس و بیکس بڑھیا کو نہ اس اندھیری رات کا خوف تھا' نہ بجلی کی کڑک کا ڈر۔ نہ بادل کی گرج سے وہ سہمتی تھی نہ آندھی کی پرشور آواز سے خائف تھی۔ وہ ہر چیز سے بے خبر تھی۔ کیونکہ اس کا لڑکا بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اور وہ بھوک سے بے چین تھا۔ اس کا سارا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ بھوک ہی اس کی تمام بیماریوں کا سبب تھی۔ طاق پر دیا جل رہا تھا۔ ہوا اور دیئے کی لو میں کشمکش جاری تھی۔ دوسری طرف لڑکے کی زندگی اور موت میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔

"ماں۔"

"کیا ہے بیٹے؟"

"ماں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

"بیٹا۔۔۔۔" ماں کی آواز لرزنے لگی اور آنکھوں سے آنسو

ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"ماں! بھوک ......" اس نے پھر ماں کو احساس دلایا۔ بچہ نقاہت سے مر رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد کمزوری سے حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پر پپیڑیاں جم گئی تھیں۔ بھوک سے پیٹ پچک گیا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ہوا کی لہر آئی اور دیا ٹمٹمانے لگا۔ دیئے کی لَو کے ساتھ ساتھ بڑھیا کا دل بھی لرزنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں دیا بدستور ٹمٹما رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کانپتے ہوئے ہاتھ دعا کیلئے بلند ہو گئے۔ "مجھ سے روشنی مت چھین میرے خدایا۔ یہ روشنی ہی تو میری زندگی ہے۔ اگر یہ دیا بجھ گیا تو میں اندھیروں میں بھٹکتی رہوں گی۔"

"ماں! تم مجھے روٹی کیوں نہیں دیتی ہو؟" وہ چارپائی کا سہارا لیکر اُٹھی اور بوجھل قدموں سے چولھے کی طرف بڑھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ڈھکن اٹھایا۔ ہنڈیا میں بجائے چاول کے پانی اُبل رہا تھا۔ غمزدہ دل کے ساتھ وہ بچے کی چارپائی کے پاس واپس آئی۔

"کھانا تیار ہو گیا ماں؟"

"ابھی نہیں بیٹا۔" وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"تو پانی ہی دے دو۔" اس نے کھانا سے ناامید ہو کر پیاس بجھا چاہی۔

"ابھی لائی بیٹا۔" ماں نے لرزتے ہاتھوں سے مٹی کے پیالے میں پانی ا

اور لڑکے کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے پانی پی کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

گلاس رکھکر ماں لڑکے کے بستر کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کو پانی سے کچھ تسکین ہو گئی تھی۔ "تم کھانا کیوں نہیں دیتیں" اس نے پوچھا۔

"بیٹا۔ ہماری تقدیر ہم سے روٹھ گئی ہے۔ ہمارے کھیت آفتِ ناگہانی کے نذر ہو گئے۔ اب ظالم آقاؤں کی تجوری کھلے گی تو کھانا بھی ملے گا۔"

"تو پھر تم اپنے خدا سے مانگو نا جس کی تم روز عبادت کرتی ہو۔"

جس کے پاس دولت ہو، خدا بھی اسی کی سنتا ہے۔ آج کی دنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔ دولت ہی مذہب ہے۔ دولت ہی انسانیت ہے اور دولت ہی خدا ہے۔"

"ہمارے پاس دولت کیوں نہیں ہے؟"

"ہمارے آقا دولت پر کنڈلی مارے بیٹھے ہیں اور دولت جونکوں کی طرح ان سے چمٹی ہوئی ہے۔ دراصل عرصے کے بعد بھی ہم ذہنی طور پر غلام ہیں۔ اور دوسروں کے دست نگر رہیں۔"

"ہم محتاج ہیں، جب ہی تو تم محل والے سیٹھ کے پاس بار بار جاتی ہو؟"

"بیشک۔ اگر وہ ہماری ضروریات پوری نہ کرے تو ہم بھوکوں مر جائیں۔"

"وہ اناج کے عوض ہم سے کیا وصول کرتا ہے ماں؟" بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

"یہ مت پوچھو میرے لال بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بتائی

نہیں جانتی۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں۔"

"تم دوبارہ اس حویلی والے سیٹھ کے پاس کیوں نہیں جاتی۔ جسکے گوداموں میں اناج بھرا ہے۔"

"زیادہ نہ سوچو بیٹے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" یہ کہہ کر ماں بیٹے کا سر سہلانے لگی۔

"یہ امیر کبیر لوگ غریبوں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ لڑکے نے تعجب سے پوچھا۔

"مدد کی خوب کہی تم نے۔ ارے ہم غریب تو ان کے نزدیک ایک حقیر غلام ہیں۔ ہم اس لائق ہیں کہ خرید لئے جائیں۔ دولت مند تو چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم پسینے بہا کر انہیں جوٹ، روئی اور دوسرے اجناس فراہم کرتے ہیں جس کے بل بوتے پر ان کی ملیں چلتی ہیں۔ وہ لباس فاخرہ پہنتے ہیں اور ہمیں تن ڈھکنے کیلئے چیتھڑا بھی میسر نہیں۔ وہ ہمارے اجناس کے عوض کانٹوں بھرے پھول دیتے ہیں۔ جن سے ہمارے اپنے ہاتھ لہولہان ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمارے بنائے ہوئے اونچے اونچے محلوں میں نرم نرم بستروں پر لطف سے رات بسر کرتے ہیں اور ہم غریب ٹھنڈی زمین پر پڑے کروٹیں بدلتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے رسیا چمکیلی کاروں میں سیر سپاٹے کرتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں کہتے ہیں کہ ان کی عیش وعشرت کی کنجی ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ وہ تو بس اس بات پر اتراتے پھرتے ہیں کہ روپوں کی جھنکار پر دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ ہم غریبوں

کا آپس میں مل جل کر رہنا بھی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ حسد کی آگ کی چنگاری جب اٹھتی ہے تو ہمارے ہمسایوں کو جلانے لگتی ہے۔"

"ایسے انسانوں کو خدا نیست و نابود کیوں نہیں کر ڈالتا' ماں؟"

"دوسرے کے گھروں میں یہ آگ لگاتے ہوئے بہت خوش ہوتے ہیں۔ مگر جب ان کے مکانوں میں شعلے بھڑکیں گے تو اپنی آگ میں جل کر آپ بھسم ہو جائیں گے۔" پھر اس کی ماں نے اسے چپ کرانے کی خاطر کہا۔" زیادہ نہ سوچو بیٹا۔ دماغ پر زور پڑے گا۔"

"اس دنیا کی سفاکی اور بربریت میں اپنی آنکھوں سے گھوم گھوم کر دیکھوں گا کہ کیا غریب سب جگہ ذلیل سمجھے جاتے ہیں؟"

"تم پوری دنیا کیسے دیکھو گے میرے لال!" ماں نے بچے کو دلاسا دیا۔

"اچھا۔ اچھا — جب اچھے ہو جاؤ گے تو دیکھنا۔"

"کیوں۔؟ میں غریب اور لاچار ہوں اس لیے — اگر میں نہیں دیکھ سکتا تو میری روح دیکھے گی۔"

"اچھے لڑکے زیادہ نہیں سوچا کرتے ...... سو جاؤ .... سو جاؤ بیٹا۔" ماں سر تھپکنے لگی۔

لڑکے کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ اس کی انگلیاں تھر تھر کانپنے لگیں۔ رفتہ رفتہ کہنی سے بازو تک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ پھر پورا جسم تھر کنے لگا۔ دکھیاری ماں کی دبی دبی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

جھونپڑی میں ہیبت ناک خموشی اتر آئی۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے ٹنگے ہوئے کپڑے لہرانے لگے۔ دفعتاً مٹی کا دیا گل ہوگیا۔ زندگی اور موت کی جنگ ختم ہوگئی۔ اور پھر ـــــ خاموشی چھاگئی ـــــ صرف ماں کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ بڑھیا نے دوبارہ دیا جلا دیا۔ لڑکے کی روح جسم سے نکل کر ہوا کے دوش پر چل رہی تھی۔ اس کی مشتاق روح دنیا دیکھنے جارہی تھی کہ شاید کہیں غریبوں اور غلاموں کی قدر ہوگی۔ روح بڑھے چلے جارہی کہ ایک جگہ رک گئی۔ وہاں شور وغل، لوٹ مار اور خون خرابہ ہو رہا تھا۔ انسان مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہا رہے تھے۔ انسان، انسان کا دشمن تھا۔ خون سے دھرتی سرخ ہو رہی تھی۔ بچوں کا گلا گھونٹا جا رہا تھا۔ عورتوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی تھیں۔ اور انسانیت وہاں کھڑی ننگی ناچ رہی تھی۔ یہ خونی ڈرامہ وہاں کھیلا جا رہا تھا۔ جہاں سیتا، ساوتری اور گوتم بدھ نے جنم لیا تھا۔ جہاں چیونٹی کی موت پر اہنسا کے پجاریوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے تھے۔

وہ وہاں سے نکل کر دوسرے محلے میں داخل ہوئی۔ بازار میں بہت چہل پہل تھی۔ بدمست لوگ اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ کوٹھوں سے طبلے کی تھاپ اور سارنگیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک کوٹھے کے نیچے بہت سے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ لوگ کئی کئی ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

"نئی نئی آئی ہے۔" ایک نے کہا۔

"ایسی چیز ایک عرصے کے بعد نظر آئی ہے۔" دوسرے کی آواز تھی۔

"چھوڑو یار کتنی چیز آتی ہے اور کتنی جاتی ہے۔ یہاں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔" تیسرے نے لاپرواہی سے کہا۔

"تم لوگ باتوں میں وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ میرا دل تو اسے دیکھنے کو بے قرار ہو رہا ہے۔" پہلے نے کہا۔

"جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔ تم کہتے ہو تو آؤ دیکھ لیتے ہیں۔"

ابھی مجرا ہونے میں دیر ہے، وقت ہونے دو پھر چلیں گے۔"

وہ کون سی چیز تھی جس کے لئے ہنگامہ برپا تھا۔ روح کا اشتیاق بڑھا۔ اور وہ ان سے پہلے کوٹھے پر پہنچ گئی۔ وہاں اسے ایک نئی طوائف نظر آئی۔ جو فرش پر سفید چاندنی بچھوائے نوکروں سے گاؤ تکیئے لگوا رہی تھی۔ ہر کونے میں قرینے سے پیک دان نظر آرہا تھا۔ وہ روح کو دیکھتے ہی مسکرائی پتہ نہیں اس نے اسے پہچان لیا تھا یا کوئی گاہک سمجھا تھا۔

"زہے نصیب۔" وہ آداب بجالائی۔

"تم یہاں نئی آئی ہو؟"

"ہاں میں اس محلے کی نئی طوائف ہوں۔" اسکے لہجے میں ایک کرب تھا۔ جیسے وہ کہنا چاہتی ہو۔

"میں بھی کبھی پاکدامن دوشیزہ اور زیورِ انسانیت سے مرصع تھی۔

مجھ میں بھی پیار کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔ میں بھی ماں، بہن اور بیوی بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح ایک خوشنما پھول تھی۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہیں گلدانوں کی زینت بننے کا موقع دیا گیا اور مجھے پاؤں تلے مسل دیا گیا۔ دوسری گھر کی زینت بن گئی اور میں کوٹھے کی۔"
نئی طوائف نے گویا اپنا دل چیر کر رکھ دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم زمانے کی ناقدری کی نذر ہو گئی ہو۔" روح نے اس سے سوال کیا۔

"مجھے دوسروں سے زیادہ اپنوں سے شکایت ہے۔ میں نے زندگی کی گھما گھمی میں اسی دھرتی پر جنم لیا۔ دوسروں کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پروان چڑھنے لگی۔ میرے محلے کے ہندو پڑوسیوں نے مجھے متبنیٰ بنا لیا۔ انگریزوں نے گھٹنوں کے بل چلایا، میرے رشتہ داروں نے میری پرورش میں دن رات ایک کر دیئے اور جب میرے رگ و پے میں شباب کا گرم گرم خون گردش کرنے لگا تو مجھے گھر سے نکال دیا گیا۔ مجھ پر زندگی کی تمام خوشیاں حرام کر دی گئیں۔ مجھے میرے حق سے محروم کر دیا گیا اور مجھے شہر بدر کر کے اس کوٹھے پر لا پھینکا۔"

"تم کون ہو؟" "تمہارا کیا نام ہے؟"

"میں اس دھرتی کی آبرو ہوں۔ میں تہذیب کا کفن ہوں۔" نئی طوائف نے اپنی اصلیت بتائی۔ "میں اردو زبان ہوں۔" نئی طوائف کی حالت زار دیکھ کر روح کو کوفت ہوئی۔ وہاں ٹھہرنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔

اچانک روح کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ فضا میں اڑی جا رہی ہو اس کے چہار طرف فلک نیلگوں اور اودے اودے بادل تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے پیر زمین پر آ ٹکے۔ اس کی آنکھوں نے وہ مقدس مقام دیکھے۔ جو یہودیوں، انگریزوں اور مسلمانوں سبھوں کیلئے قابل تعظیم ہے۔ یہ سرزمین عربوں کے سینے پر اسرائیل کا خنجر بن کر پیوست ہو گئی تھی۔ اب اس کے زخم سے خون رس رس کر سارے عرب کو گلنار کر رہا تھا۔ مغربی آقاؤں نے یہ سرسبز و شاداب ساحلی علاقہ بین الاقوامی بنیوں کے حوالے کر کے بیس لاکھ عربوں کو ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ مسجدیں یہودیوں کی بدتمیزی اور نازیبا حرکات کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ جہاں کبھی اذان کی آواز گونجا کرتی تھی۔ اب وہاں ہر وقت فوجی نوجوانوں اور پولیس کے بوٹوں کی آواز سے در و بام لرز رہے تھے۔ توسیع ریاست کے ہوس میں ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے تھے۔ اس نے ایک عمارت دیکھی جو گولہ باری سے ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی یہ معصوم بچہ یتیمی کا اشتہار بنا رو رہا تھا۔ مگر کوئی بھی اس کا پرسان حال نہیں تھا۔ روح نے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی پائی اور دوسرے لمحہ وہ کسی طیارے کی طرح اڑتی جا رہی تھی۔ برق رفتاری سے ایک نئی دنیا کی طرف۔ جہاں کے لوگ اپنے آپ کو بہت ہی مہذب اور انسان دوست سمجھتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو ساری دنیا کا آقا سمجھتے ہیں۔

یہ تاریک براعظم تھا۔ باہر سے آئی ہوئی اقلیت نے وہاں کی اکثریت کے گلے میں غلامی کا طوق پہنا رکھی تھی۔ جہاں سفید فام لوگ اپنی آنکھوں پر عصبیت کی عینک لگائے وہاں کے عوام کو ان کے سیاہ رنگ ہونے کی بنا پر حیوان سے بدتر سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اسکول، ان کے گاؤں اور رہائش گاہیں بھی الگ الگ بنا دی گئی تھیں۔ حالانکہ وہ کم عقل لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ سیاہ و سفید چمڑی کے نیچے ایک ہی قسم کا خون رگوں میں دوڑتا ہے۔ جس کا رنگ سرخ اور صرف سرخ ہوتا ہے۔

اس سرزمین پر روح کے لئے ٹھہرنا دوبھر ہوگیا۔ وہ وہاں سے سرپٹ بھاگی دوبارہ مشرق کی طرف۔ جہاں سے طلوع آفتاب کی سرزمین نزدیک تھی۔

یہ وہ خطۂ مشرق تھا۔ جہاں آزادی، حب الوطنی اور سالمیت کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ ایک طرف دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں تھیں، دوسری طرف ایمان، خود اعتمادی اور سرفروشانہ جذبہ تھا۔ جو شمع آزادی کو روشن کئے ہوئے تھا۔

سمندر پار سے آئے ہوئے فوجیوں کی بمباری اور دیگر جنگی کارروائیوں سے اڑھائی لاکھ سے زیادہ بچے مارے جاچکے تھے۔ بے شمار بچے ٹانگوں، بازوؤں اور آنکھوں سے محروم ہو گئے تھے۔ روح نے ان بچوں کو گلیوں میں پیٹ کے بل رینگتے یا خاردار تاروں کے عقب میں گوشت کے بدشکل لوتھڑوں کی طرح پڑے دیکھا۔

نیپام بم وہ ہتھیار ہے جس سے ساڑھے ستانا لاکھ بچوں کے جسم آگ

اور فاسفورس سے جھلس گئے تھے۔ ان کے معصوم چہرے بگڑ کر ہیبت ناک ہو گئے تھے۔ ہزار ہا بچے خوراک اور علاج کے فقدان کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ شہروں اور قصبوں میں گداگری کرتے پھر رہے تھے۔ نہ ان کے ماں باپ کا پتہ تھا اور نہ ہی ان کے رہنے کا ٹھکانہ۔ یتیم اور بے گھر بچیاں دس دس برس کی عمر میں جسم فروشی پر مجبور ہو گئی تھیں۔ فوجوں کی موجودگی سے ملک کی اخلاقی حالت بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ رشوت، بدعنوانی، عصمت فروشی، نائٹ کلب اور شراب خانے عام تھے۔ وہاں کی خواتین جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر جنگ آزما تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے مادر وطن کو غلامی کے پنجے سے چھڑانے کیلئے گولیوں کی بوچھاڑ میں کود پڑے۔ جس قوم میں ایسے جیالے اور سرفروش ہوں۔ وہ زندگی کے تاریک لمحوں میں بھی روشن مینار ثابت ہوتے ہیں۔ جس کی رہنمائی سے دوسری قومیں بھی خواب غفلت سے بیدار ہو جاتی ہیں۔ روح نے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ انسانیت کے علمبرداروں کے منہ پر تھوکے جنہوں نے اپنے چہرے پر شہنشاہیت کا جھوٹا نقاب چڑھا رکھا تھا۔ وہ وہاں سے واپس جانے کے لئے بے چین نظر آنے لگی۔

روح تیزی سے اپنے سفر پر رواں دواں تھی کہ اچانک ایک جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔ یہ بہت ہی سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ مگر مصیبتیں اور آفتیں بادل کے سائے بن کر چھائی ہوئی تھیں۔ دریا کا پانی خون کی طرح

سرخ تھا۔ خشک سالی، چیل کوؤں اور گدھ کی شکل میں منڈلا رہی تھی درختوں کی ٹہنی ٹنڈ منڈ ہو کر شرمندگی سے جھک گئی تھی۔ لوگ کیڑے مکوڑے کی طرح رینگ رہے تھے۔

ایک ادھیڑ عمر کا شخص جس کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ کچھ ہی دن پہلے اسکے چہرے پر بھی رونق اور شادابی تھی۔ مگر اس وقت تو وہ خفت اور شرمندگی سے اپنا ماتھا پیٹ رہا تھا کیونکہ اس نے جس نو مہینے کے بچے کی پرورش کی تھی وہ راکششش نکلا۔ سامنے والے سوکھے پیڑ پر چڑھ بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ سر پر سینگ تھا اور کئی معصوم بچوں کا خون کر کے ڈال پر اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ پیڑ کے نیچے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ لوگ اسے اینٹ پھینک پھینک کر مار رہے تھے تاکہ وہ راکششش نیچے اترے اور پھر اس کا تکا بوٹی کر دیا جائے۔ لوگ اس کے خون کے پیاسے تھے۔ اس کا باپ آنکھوں سے شرمندگی کے آنسو پوچھ پوچھ کر اس دن کو کوس رہا تھا کہ ایسے بچے نے میرے یہاں کیوں جنم لیا۔ جس سے سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں۔ وہ بوڑھا باپ جو اس راکششش کا خالق تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا کی طرح کھٹکنے لگا۔ اسے اپنا وجود خطرے میں محسوس ہوا۔ چنانچہ اپنے ہم رکابوں اور رہواریوں کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر فرار ہونا چاہا مگر جب کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو انہیں پتہ چلا کہ کشتی میں جگہ بہ جگہ سے سوراخ ہو چکا ہے۔ کشتی میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا۔

ساحل پر پہنچنے کے لئے انہوں نے جلدی جلدی پتوار چلانا شروع کیا۔ مگر ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی کشتی اپنے سوار سمیت دریا میں ڈوب گئی۔ وہ اس قرسا منظر سے بے چین ہو اٹھی۔

اچانک لڑکے کے چہرے پر کوئی ٹھنڈی چیز پڑی اور اسکے سامنے کا منظر دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا۔ ماں اسے پانی کے چھینٹے دے کر ہوش میں لا رہی تھی۔ "بیٹا! بیٹا!" اس کی ماں نے آواز دی۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولدیں۔ اور اپنے آپ کو اپنے بستر پر موجود پایا۔

"میں کہاں ہوں؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"اپنی جھونپڑی میں....." ماں نے اپنے بچے کو ہوش دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"مگر میری روح توان انسانوں کو دیکھنے گئی تھی جو اپنے سے کمتر انسانوں کو غلامی کا طوق پہنا کر ہمیشہ کیلئے محکوم بنا لیتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟" ماں نے تصویر استعجاب بن کر پوچھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" لڑکے نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم تو بے ہوش ہو گئے تھے، شاید تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔"

"نہیں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میری روح ظالموں کے حرکات دیکھنے گئی تھی۔ مجھے اس انسان سے گھن آنے لگی ہے جو کمزوروں کا خدا بن

بلیٹھا ہے۔ میں بڑا ہو کر دنیا کو بتا دوں گا کہ ہر انسان آپس میں برابر ہے۔ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں۔ سبھوں کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جائے۔ اب ہمیں بڑا بننا پڑے گا تاکہ دنیا میں کوئی بندہ رہے اور نہ کوئی بندہ نواز۔"

"نہیں بیٹا۔ تم اتنی بڑی طاقت سے کیسے ٹکر لے سکتے ہو، ان بنیوں کے دل و دماغ بھی سونے چاندی کے ہیں۔ وہ تمہیں کبھی بھی آگے بڑھنے نہیں دیں گے۔ ان کی خواہش کے مطابق ہمیں برابر ان کا دست نگر رہنا چاہیئے۔"

"میں اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ ظالموں سے گن گن کر بدلہ لوں گا۔ اگر اس جنم میں نہیں تو دوسری جنم میں۔ اسی طرح جتنے بھی جنم لوں گا مگر ان کی آقائی کو ختم کر کے دم لوں گا۔"

ماں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور لڑکا اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔ جھونپڑی کے اندر پہلے کی طرح اداسی چھائی ہوئی تھی۔ طاق پر ہوا اور دیئے کی لو میں کشمکش جاری تھی۔

آخری لفظ

پروفیسر سرمد جمالی۔ ایم۔ اے
صدر شعبۂ اردو
دولت پور گورنمنٹ کالج۔ کھلنا

"میں افسانہ نگاری کو ادب کی سہل ترین صنف سمجھتا ہوں۔ جس کے لئے کم سے کم علمیت کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں جو شخص بھی خط لکھ سکتا ہے، وہ ذرا سی کاوش سے ایک کامیاب افسانہ نگار بن سکتا ہے، یہ میں تفنن کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ذرا اس خیال کا تجربہ کر کے دیکھئے۔"

یہ الفاظ اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار غلام عباس کے ہیں اس کے بعد آگے چل کر موصوف رقمطراز ہیں کہ آپ پوچھینگے کہ افسانے میں کیا ہو، اس میں کیا لکھا جائے"؟ اس کے جواب عرض کروں گا کہ ہر وہ بات جو آپ کے مشاہدے میں آئی ہو اور آپ نے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہو، یا زندگی کا کوئی ایسا رخ ہو جو آپ نے دیکھ لیا ہو، جو عام لوگوں سے پنہاں رہتا ہو۔ اس کو اس طرح لکھ ڈالئے جس طرح آپ نے دیکھا یا محسوس کیا ہو، اور افسانہ مکمل ہے"۔

افسانہ نگاری کی یہ سادہ اور دلچسپ تعریف، بلاشبہ اپنی جگہ

بہت خوب ہے۔ مگر بقول فانیؔ۔

؎ کہتے ہیں محبت آساں ہے، واللہ بہت آساں ہے مگر۔
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سے مشکل میں نہیں۔

افسانہ نگاری کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔

؎ اس سہل میں جو دشواری ہے، وہ مشکل سی مشکل میں نہیں

جس طرح غزل گوئی بظاہر بہت ہی آسان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اچھا شعر کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اسی طرح افسانہ لکھنے کو تو ہر وہ شخص لکھ سکتا ہے جو خط لکھ سکتا ہے، لیکن اچھا افسانہ لکھنا لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ منشی پریم چند آنجہانی کے زمانے سے لے کر آج تک اول درجہ کے افسانہ نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

افسانہ نگاری کا فن سہل ممتنع ہے، یعنی آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس کسوٹی پر بہت کم کھرے اترتے ہیں۔ مغربی ادب کی تو بات خیر رہنے دیجئے کہ اس بحر ذخار میں سینکڑوں موتی پڑے دمک رہے ہیں، لیکن خود اردو ادب میں بھی افسانہ نگاری نے اتنی کم مدت میں جو قابل رشک ترقی کی ہے، وہ لائق صد تحسین ہے، اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ہی نے ہر شخص کو اس کی طرف متوجہ کر لیا اور اب حال یہ ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ۔ اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ان حقائق کی روشنی میں مشرقی بنگال کے صنعتی مرکز کھلنا سے

شاؔم بارکپوری کا افق افسانہ نگاری پر ابھرنا، ایک ادبی معجزہ سے کم نہیں۔
شاؔم ابھی عمر کی اس منزل پر ہے، جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؂

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی ۔ جوانی کی راتیں ہیں شرشاریاں ہیں

اور اس پر مستزاد، دولت کی فراوانی۔ لیکن (اور یہی لیکن بہت اہم ہے) قدرت کی اس فراخدلی سے ہمارے نوجوان افسانہ نگار نے قطعی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنی ساری زندگی علم و ادب کے مطالعہ اور اپنے افسانوی شوق کو پروان چڑھانے کیلئے وقف کردی۔ شاؔم کا پورا نام شاہ محمد ہے اور وہ مغربی بنگال کے قصبہ بارکپور کے متمول خاندان کا فرد ہے۔ وہاں کی مادری زبان عام طور پر بنگالی ہے۔ لیکن شاہ محمد کے گھرانے میں اردو بولی جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے کافی دنوں بعد شاؔم کے افراد خاندان کھلنا آئے اور یہاں تجارتی حلقے میں ایک امتیازی شان کے مالک بن گئے۔ اس پس منظر میں شاؔم کی افسانہ نگاری پر کڑی تنقیدی نظر ڈالنی سراسر ناانصافی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک نوجوان طالب علم جب اردو افسانہ کی طرف اپنا عنان قلم موڑتا ہے تو کیا کیا گل افشانیاں کرتا یا کرسکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی جذبہ ہے۔ جس نے مجھے متاثر کیا اور میں شاؔم کے اس والہانہ شوق کی پذیرائی پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ اسے اپنے فن سے پیار ہے، وہ اسکے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ اس کی یہی لگن اور شیفتگی اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ وہ بچپن ہی سے افسانہ نگاری کی طرف مائل ہے۔ اس کا پہلا افسانہ "آنسو" ہے۔ جو "فنکار" کراچی میں شائع ہوا۔

اس میں اس کے دکھی دل کی دبی دبی کسک اور میٹھا میٹھا سا درد ہے
یہ وہ پہلا آنسو ہے جو اس نے دامنِ اردو پر ٹپکایا اور اس کی نمی آج بھی اس کے
دیگر افسانوں میں موجود ہے۔ "بدھا کے کنارے اور" ماں" کامیاب اف
ہیں۔ "روح" سے بھی انفرادیت کی شان ٹپکتی ہے۔ "سانپ اور انسان"
"کمزول" اور "دھرتی کو آکاش پکارے" بھی ہماری توجہ اپنی طرف منعطف
کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ سارے افسانے ہندو پاک کے مقتدر جرائد میں شائع
ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

لیکن مجموعی طور پر مجھے یہ کہنے میں ایک لمحہ کیلئے بھی تامل نہیں کہ
شام کا افسانوی مستقبل اپنے اندر بہت ہی روشن امکانات کا حامل ہے، اور
میں شام کیلئے صرف یہی دعا کر سکتا ہوں کہ ؎

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

۸ر جنوری ۱۹۷۶ء